رُموزِ اوقاف

کب، کہاں اور کیوں؟

مولف

ڈاکٹر شمس بدایونی

رموزِ اوقاف

کب، کہاں اور کیوں؟

ڈاکٹر شمس بدایونی

رموزِ اوقاف

کب، کہاں اور کیوں؟

مولف

ڈاکٹر شمس بدایونی

انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) 1696

© All rights reserved. No part of this publication may be reproduced, stored in a retrieval system, or transmitted, in any form or by any means, electronic, mechanical, photocopying, recording or otherwise, without the prior written permission of the Anjuman Taraqqi Urdu (Hind) New Delhi. This includes translation and tranliteration into any language.

نام کتاب	:	رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟
مصنف	:	ڈاکٹر شمس بدایونی
سنِ اشاعت	:	2024
اشاعت	:	اوّل
قیمت	:	300/-
بہ اہتمام	:	محمد ساجد
طباعت	:	اِمیج اینڈ امپریشن، دریا گنج، نئی دہلی

Rumooz-e Auqaaf: Kab, Kahan aur Kyun?

by : Dr Shams Budauni

Price : 300.00

Year : 2024

ISBN : 978-81-970897-6-3

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002

Contact: +91-11-23237722, Email: farouqui@yahoo.com

E-mail: contact@atuh.org, www.atuh.org

ترتیب

پیش گفتار	مرتب	7
معروضات	ڈاکٹر رؤف پاریکھ	13
❖ علامات-مخففات	مرتب	17
❖ تاریخِ رُموزِ اوقاف (ماقبل و مابعدِ سرسید)	مرتب	57
❖ رُموزِ اوقاف-مفہوم، منشا اور تعبیر	مرتب	104
❖ رُموزِ اوقاف-تعریف اور اہمیت	مشاہیرِ ادب	116
❖ ختمہ	مشاہیرِ ادب	126
❖ سکتہ	مشاہیرِ ادب	132
❖ وقفہ	مشاہیرِ ادب	149
❖ رابطہ	مشاہیرِ ادب	156
❖ سوالیہ	مشاہیرِ ادب	164
❖ فجائیہ، ندائیہ	مشاہیرِ ادب	171
❖ قوسین	مشاہیرِ ادب	176
❖ واوین	مشاہیرِ ادب	184
❖ اضافی یا اختیاری اوقاف	مرتب	194

❖ رُموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟	مرتب	200
❖ کتابیات	مرتب	208
❖ اشاریہ	مرتب	210

پیش گفتار

پیشِ نظر کتاب تین مقالات پر مشتمل ہے۔ یہ تینوں مقالات مختلف اوقات میں لکھے گئے۔ ان کے لکھنے کے محرکات بھی ایک دوسرے سے جداگانہ تھے؛ لیکن موضوع و مواد کی یکسانیت نے انھیں ایک جگہ مرتب کر کے پیش کرنے پر آمادہ کیا۔ اس طور یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ یہ علامات، مخففات اور رموزِ اوقاف پر لکھی جانے والی کتاب کے تین ابواب ہیں۔

پہلا مقالہ ''علامات-مخففات'' دراصل میرا ایک لکچر ہے جو شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے زیرِ اہتمام اساتذۂ اردو کے ریفریشر کورس کے لیے ۳ر نومبر ۲۰۲۳ء کو آن لائن دیا گیا تھا۔ یہ اردو کی قدیم و جدید لفظی، حرفی، عددی اور نشانات پر مشتمل ۱۲۲ علامات پر مشتمل ہے، جو کسی ایک جگہ یکجا نہیں ملتیں۔ چند کے سوا بیشتر اردو کی مستند لغات میں بھی بار نہیں پاسکیں۔ ان کا تلفظ، ان کا صحیح ترین محلِّ استعمال، ان کی متعارف شکلیں، ان کی اصل تک رسائی کے لیے خاصی تلاش و جستجو کرنا پڑی۔ کمپیوٹر کتابت میں ان میں سے بعض کو اصل کے مطابق پیش کر پانا ممکن نہ ہوا؛ لہٰذا سیاہ جلی قلم سے از خود یہ علامتیں سفید کاغذ پر بنا کر، ان کے فوٹو ناظرین کو دکھائے گئے۔ ناظرین نے اس لکچر کو بہت پسند کیا۔ شعبۂ اردو کے چند اساتذہ نے اصرار کیا کہ اس لکچر کو مرتب کر کے شائع کرا دینا چاہیے۔ چنانچہ اس لکچر کو صفحات پر منتقل کیا گیا اور اسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے تحقیقی مجلّے 'فکر و تحقیق' کو اشاعت کے لیے بھیج دیا گیا۔

فکر و تحقیق کے ادارتی عملے کو بھی اسے قابلِ اشاعت بنانے کے لیے خاصی محنت کرنا پڑی۔ اِن پیج سے کورل میں منتقل کرنے کے باوجود بعض علامتیں کاغذ پر اتارنے میں ناکامی ہاتھ لگی۔ ایسی علامتوں کے نشان مجھے ہاتھ سے بنا کر انھیں دینا پڑے۔ اس طرح یہ مقالہ جنوری-مارچ ۲۰۲۴ء کے شمارے میں اشاعت پذیر ہوا۔ اشاعت کے دوران بھی اس میں مزید کچھ اضافے ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ اردو علامات ومخففات سے متعلق اتنا مبسوط مقالہ پہلی مرتبہ لکھا گیا ہے، جس میں کلاسیکی متون اور قدیم مخطوطات میں مستعمل ان علامات ومخففات کی تعریف وتشریح کردی گئی ہے اوران کے استعمال کی مختلف صورتوں کو بھی علیحدہ علیحدہ بیان کردیا گیا ہے۔ موجودہ دور میں کون سے مخففات وعلامات قابلِ استعمال ہوسکتے ہیں ان کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ ساری بحث اجتماعی طور پر مستعمل علامات ومخففات سے متعلق ہے۔ انفرادی طور پر اختیار کردہ یا وضع کردہ نامانوس علامتوں میں سے بعض کا ذکر تو برائے بحث اس مقالے میں کیا گیا ہے؛ لیکن وہ ہمارا موضوع نہیں، اور انھیں موضوع بنایا بھی نہیں جاسکتا۔

دوسرا مقالہ ''تاریخِ رموزِ اوقاف'' (ماقبل ومابعدِ سرسید) آج سے آٹھ سال پہلے لکھا گیا تھا۔ اس کی پہلی اشاعت ماہنامہ ''تہذیب الاخلاق'' (علی گڑھ) کے سرسید نمبر اکتوبر ۲۰۱۶ء اور دوسری اشاعت اضافوں کے ساتھ اسی رسالے کے اکتوبر ۲۰۱۷ء کے سرسید نمبر میں ہوئی تھی۔ تیسری بار یہ مع اضافہ جات میری کتاب 'جہات سرسید (علی گڑھ ۲۰۱۸ء) میں شامل ہوا۔ جو مآخذ تیسری اشاعت کے وقت تک دستیاب نہیں ہوسکے تھے وہ دسمبر ۲۰۲۳ء میں اچانک ہاتھ آگئے۔ اس طور یہ مآخذ جہاں مقالے میں اضافے کا موجب بنے وہیں بعض پرانے پیش کردہ بیانات کی مزید صحت کا سبب بھی بنے۔ اس کتاب میں شمولیت کے لیے مقالے کے عنوان میں جزوی تبدیلی کی گئی ہے۔

اس مقالے میں ماقبل ومابعدِ سرسید، اردو رموزِ اوقاف کی مکمل تاریخ سلسلہ وار ارتقائی صورت میں پیش کی گئی ہے۔ یہ تاریخ فورٹ ولیم کالج کے قیام (۱۸۰۰ء) سے

آج تک کے اصولی و عملی منظر نامے کو پیش کرتی ہے۔ اس میں نہ صرف تاریخی بلکہ تحقیقی، تجزیاتی اور احتسابی طریقۂ کار کو بھی اختیار کیا گیا ہے۔ مختلف عہد کے متعدد توقیف نگاروں کی سفارشات یا تجویزوں تک گفتگو کو محدود نہ رکھ کر ان کی اپنی تحریروں اور ان کے عہد کے دوسرے ادیبوں کے یہاں ان مجوزہ اوقاف کے استعمال کی مثالیں تلاش کی گئی ہیں اور بیش از بیش مثالیں نقل کر کے اس بحث کو ایک عہد سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے اور تیسرے سے چوتھے یعنی معاصر عہد تک لا کر ختم کیا گیا ہے۔

اوقاف کی قدیم صورتیں کیا تھیں؟ انگریزی اوقاف اردو میں کب اور کس طرح آئے؟ کن ادیبوں نے انھیں متعارف کرانے اور رواج دینے کی سفارش کی؟ کس نے پہلی بار انگریزی پنکچوئیشن کو اردو نام 'رموزِ اوقاف' دیا؟ کن لوگوں نے ان کے اردو نام تجویز کیے اور کس نے ان کی تعداد کا تعین کیا؟ اس سلسلے کے جملہ مباحث اس مقالے میں آ گئے ہیں۔ گویا اردو رموزِ اوقاف کی تاریخ مرتب کر دی گئی ہے۔

تیسرا مقالہ ''رموزِ اوقاف'' خاص اس کتاب کے لیے لکھا گیا ہے اس میں رموزِ اوقاف کی تعریف، مروج و مستعمل آٹھ رموزِ اوقاف میں سے ہر ایک کو علیحدہ عنوان دے کر اس پر اردو میں جو کچھ لکھا گیا اسے تاریخی تسلسل میں یکجا کر دیا ہے۔ اس طور اوقاف کی ۱۸۴۵ء سے ۱۹۹۴ء تک تقریباً ڈیڑھ سو سال کے دوران کی جانے والی تعریف و توضیح اور تشریح یکجا ہو گئی ہے۔ ان تمام تشریح نگاروں کے بیانات کو تاریخی تسلسل میں نقل کیا گیا ہے۔ جہاں کہیں کوئی بات محلِّ نظر آئی یا قابلِ وضاحت معلوم ہوئی یا پیش کردہ تشریح پر کوئی اضافہ کی صورت نظر آئی، اسے 'عرض مرتب' کے تحت اسی تشریحی بیان کے بعد پیش کر دیا گیا ہے۔ ان تشریحات میں قواعد سے متعلق بعض اصطلاحیں اور بعض نامانوس الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ قاری کی سہولت کے لیے ان نامانوس یا مشکل لفظوں کے معانی متن کے بیچ قلابین میں درج کر دیے گئے ہیں؛ لیکن وضاحت طلب لفظوں یا اصطلاحوں کے مطالب 'اردو لغت تاریخی اصول پر' سے

اخذ یا استفادہ کر کے حواشی میں دیے گئے ہیں۔ یہ حواشی مقالوں کے آخر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

اس مقالے میں آٹھ اوقاف پر ادب کے نو فاضلوں کی تشریحات اور عرضِ مرتب کے بعد بظاہر کسی اور تحریر کی ضرورت نہیں تھی؛ لیکن راقم الحروف نے اسے آخری حد تک کارآمد اور مفید مطلب بنانے کے خیال سے اس میں دو تحریروں کا اضافہ کیا:

(۱) اختیاری یا اضافی اوقاف: اس عنوان کے تحت انگریزی کے ان پنکچوئیشن کا تعارف پیش کیا گیا ہے، جو اردو میں پہلے مستعمل تھے؛ لیکن اب متروک ہو چکے ہیں۔ اسی کے ساتھ بعض ان علامتوں کا بھی اشاریہ دیا گیا ہے جن کا بعض صورتوں میں استعمال روا رکھا گیا ہے۔

(۲) رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟ اس عنوان کے تحت سوال و جواب کی صورت میں رموزِ اوقاف سے متعلق اشکالات کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کے آخر میں کتابیات اور اشاریہ پیش کر دیا گیا ہے۔

چونکہ یہ علیحدہ علیحدہ مقالات ہیں، اس لیے ان میں بعض باتیں سلسلۂ گفتگو کو صحیح طور پر قائم رکھنے کے لیے دہرائی بھی گئی ہیں۔ اس قسم کی تکرار بسا اوقات ناگزیر ہو جاتی ہے۔ انھیں حذف کر دینے سے نفسِ مضمون کے متاثر ہونے کا خدشہ بنا رہتا ہے۔ ان مکررات کے لیے قارئین سے معذرت خواہ ہوں؛ لیکن مجھے یقین ہے کہ موقع بہ موقع دہرائی گئی چند باتیں رفتارِ مطالعہ میں حارج نہیں ہوں گی۔

اس کتاب کی ترتیب کے دوران کئی مواقع ایسے آئے جہاں خاصی تلاش و تفتیش کرنا پڑی؛ لیکن نتیجہ صفر رہا۔ سرسید احمد خاں نے انورٹڈ کاماز کی یہ شکل '' '' متعارف کرائی۔ عبدالحق نے ۷ کو اردو ہائی فن (زنجیرہ) قرار دیا۔ ان دونوں شکلوں کو انگریزی پنکچوئیشن سے متعلق مقالات اور انگریزی کی قدیم مطبوعات میں تلاش کرنے کی سعی کی، مگر ان تک رسائی نہیں ہو سکی۔ آخر ان دونوں علامتوں کو ان بزرگوں کے تفردات کے طور پر قبول کر لیا۔

اسی طرح کا ایک مسئلہ یہ بھی الجھن کا سبب بنا۔ شیخ امام بخش صہبائی کی قواعد اردو سے متعلق کتاب کی تیسری اشاعت سرورق کے اندراج کے مطابق باسم ''رسالۂ صرف ونحوِ قواعد اردو'' شائع ہوئی؛ لیکن خاتمۃ الطبع اور رسالہ کے اندرونی صفحات پر نمبر شمار کے بالمقابل مسلسل ہر صفحے پر یہ نام درج ملتا ہے۔ ''رسالۂ قواعد صرف ونحو اردو''۔ بہ ظاہر یہ دوسرا نام ہی درست معلوم ہوتا ہے؛ لیکن کتابوں کا اندراج کتب خانوں کی فہرست میں چونکہ سرورق کے مطابق ہی کیا جاتا ہے؛ لہٰذا حوالے میں اسی نام کو اختیار کرنا پڑا۔ تحقیق کا یہ وہ جبر ہے جس سے شاید ہر تحقیقی کام کرنے والے کو گزرنا ہی پڑتا ہے۔

اس کتاب کی ترتیب میں جن بزرگ دوستوں کا تعاون حاصل رہا، وہ مخطوطاتِ اردو، عربی اور فارسی کے بالترتیب تین متخصص پروفیسر عبدالرشید (دہلی)، ڈاکٹر اجمل اصلاحی (دہلی) اور ڈاکٹر عارف نوشاہی (اسلام آباد) اور لغت و فرہنگ کے ماہر ڈاکٹر رؤف پاریکھ (کراچی) ہیں۔ میری طلب پر پروفیسر عبدالرشید صاحب نے آن لائن خاصا مواد فراہم کیا۔ میرے اشکالات کو رفع کیا اور تکمیل کتاب کے بعد اسے حرف بہ حرف پڑھ کر اہم اور مفید مطلب مشوروں سے نوازا۔ ان کی علم دوستی اور معارف پروری مثالی ہے۔ تحقیق کے اس دورِ بے چراغ میں ان کی ذات وجہِ نشاط ہے۔

ڈاکٹر اجمل اصلاحی صاحب نے عربی کی بعض علامتوں، مشکل لفظوں کے معانی اور تلفظ وغیرہ سے متعلق میرے استفسار پر فوری جواب مرحمت فرمایا۔ ڈاکٹر عارف نوشاہی نے علامتوں سے متعلق مقالے کو بالاستیعاب پڑھ کر قیمتی مشوروں سے نوازا۔

معروف محقق اور لغت و فرہنگ کے متخصص ڈاکٹر رؤف پاریکھ (کراچی) نے ازراہِ علم دوستی اس کتاب کو ملاحظہ فرمایا۔ بعض تسامحات کی نشاندہی کی اور کچھ نئی معلومات سے مطلع فرمایا۔ انھوں نے 'معروضات' کے عنوان سے اس پر تعارف لکھا جو میرے لیے باعثِ فخر ہے۔

عزیز دوست ڈاکٹر عطا خورشید (علی گڑھ) نے بھی علامتوں سے متعلق مقالے کو

پوری توجہ سے پڑھا اور اپنے ایرادات و تاثرات خط کی شکل میں مجھے بھیجے۔ اس میں جو چیزیں میرے کام کی تھیں، ان کا اضافہ مقالے میں کیا اور جن سے مجھے اتفاق نہیں تھا، ان کو نظر انداز کیا۔ ان سبھی بزرگوں دوستوں کی توجہات کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

علامتوں سے متعلق مقالے پر انتھک محنت کرنے کے باوجود میری یہ خواہش تھی کہ یہ کتابی شکل میں آنے سے قبل ایسے چند علمائے ادب کی نظر سے گزر جائے جو وسیع المطالعہ اور صائب الرائے ہوں۔ خدا نے یہ خواہش پوری کی اور میرے محسنوں نے اسے پڑھ کر جہاں میری محنت کی داد دی وہیں اس میں اپنے علم کے رنگ بھی بھر دیے۔ ان کے فرمودات ان کے نام کے اعلان کے ساتھ متعلقہ علامت کی تشریح میں نقل کر دیے گئے ہیں۔

ان کے علاوہ پروفیسر عبدالستار دلوی (بمبئی)، سید مسعود حسن (پٹنہ)، پروفیسر جمشید احمد ندوی (بمبئی) اور مولانا فیصل احمد بھٹکلی (لکھنؤ) اور ڈاکٹر سنجے کمار (الہ آباد) نے بعض مطلوبہ کتب و مضامین کے عکس فراہم کیے۔ ان سبھی علم دوستوں کا ممنون ہوں۔

انجمن ترقی اردو نے اردو رسم الخط، املا اور رموز اوقاف سے متعلق ماضی میں جو کارگزاریاں انجام دیں، اس کا تقاضا تھا کہ یہ کتاب انجمن کی جانب ہی سے شائع کی جائے۔ ڈاکٹر اطہر فاروقی نے بغیر کسی پس و پیش کے اسے ممکن بنا دیا۔ ان کی یہ علم دوستی قابلِ تحسین ہے۔

ناسپاسی ہوگی اگر ڈاکٹر عبدالقوی (علی گڑھ) کا شکریہ ادا نہ کروں۔ انھوں نے علامتوں سے متعلق مقالے کی تھکا دینے والی کمپوزنگ کو بہ خوشی پورا کیا اور بار بار کی تصحیحات اور اضافوں سے دل برداشتہ نہیں ہوئے۔

امید ہے کہ علامات، مخففات اور رموزِ اوقاف پر لکھی جانے والی اس تحقیقی کتاب کا ادبی حلقوں میں خیر مقدم کیا جائے گا۔

علی گڑھ، ۲۶ رجنوری ۲۰۲۴ء

شمس بدایونی

معروضات

رموزِ اوقاف کیا ہیں؟

جسے ہم اردو میں رموزِ اوقاف کہتے ہیں اس کا انگریزی نام punctuation ہے۔ اوکسفرڈ کی لغت کے مطابق punctuation سے مراد ہے: وہ نشانات جو تحریر میں جملوں اور ان کے بنیادی حصوں کو الگ کرنے اور معنی کی وضاحت کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اوکسفرڈ کے Manual of Style کے مطابق رموزِ اوقاف کا وجود اس لیے ہے کہ تحریر کے معنی واضح ہو سکیں اور اس کے پڑھنے میں سہولت ہو۔

انسائیکلوپیڈیا برٹنیکا نے رموزِ اوقاف کی تعریف میں طباعت وحروف کاری سے متعلق نشانات اور روایتی علاماتِ قرأت کے ساتھ الفاظ کے درمیان فاصلے (spacing) کو بھی شامل کرتے ہوئے رموزِ اوقاف کو متن کی تفہیم اور خواندگی میں مساعدت (aid) قرار دیا ہے، خواہ یہ خواندگی با آوازِ بلند ہو یا خاموشی سے۔ برٹنیکا نے رموزِ اوقاف کے اشتقاق اور تاریخ سے متعلق بھی خاصی تفصیل دی ہے جس کا یہاں مختصر ذکر ہی ممکن ہے۔ برٹنیکا کے مطابق punctuation کا لفظ لاطینی کے punctus سے مشتق ہے جس کا ایک مطلب ہے نقطہ۔ پندرھویں سے اٹھارھویں صدی تک انگریزی میں punctuation کا ایک مفہوم تھا اشارہ کرنا، توجہ مبذول کرانا، نشان دہی کرنا۔ دوسرے مفہوم میں اس لفظ کا استعمال انگریزی میں استعمال سولھویں صدی کے وسط میں شروع ہوا اور اس سے مراد تھی عبرانی متون میں الفاظ میں بعض حروف کے اوپر یا نیچے تلفظ کی وضاحت کے لیے لگائے جانے

والے نقطے یا چھوٹی لکیریں۔انگریزی میں سولھویں صدی کے بعد punctuation کے نظریات اور عملی استعمال کے ضمن میں دو مکاتبِ فکر رہے، ایک قرونِ وسطیٰ کا عملی استعمال جس میں نقطوں کو خواندگی میں وقفے کی نشان دہی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، بالخصوص اگر پڑھنے والا بآوازِ بلند حاضرین سے مخاطب ہو۔ دوسرا مکتبِ فکر جو نحوی کہلاتا تھا رموزِ اوقاف کو حسبِ دل خواہ یا اختیاری کے بجائے انھیں جملوں کی قواعدی ساخت کے لیے رہنما بنانا چاہتا تھا اور سترھویں صدی کے اختتام تک اسی نحوی مکتب کو قبولیت حاصل ہوگئی۔

مختصراً یہ کہ رموزِ اوقاف (punctuation marks) وہ نشانات وعلائم و رموز و مخففات ہیں جن کی مدد سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ کسی متن کو کیسے پڑھنا ہے۔ان علامات و نشانات کی عدم موجودگی میں متن کا مفہوم تبدیل ہونے کا بھی خطرہ رہتا ہے جس کی طرف ڈاکٹر شمس بدایونی صاحب نے اس کتاب میں اشارہ بھی کیا ہے۔

انگریزی میں جو رموز عام طور پر رائج کہے جاتے ہیں وہ یہ ہیں: وقفِ کامل یا فل اسٹاپ جسے پیریڈ بھی کہا جاتا ہے، وقفہ یا کاما، قول نشان، سوالیہ نشان، فجائیہ، قوسین، تین نقطے یا علامت حذفِ متن (ellipsis)، ڈیش جو چھوٹی سی افقی لکیر ہے اور اردو اور انگریزی میں الگ الگ مفہوم اور استعمال رکھتی ہے، تفصیلیہ یا کولن، سیمی کالن۔اوکسفرڈ کے مینول اوف اسٹائل نے اس میں apostrophe یعنی علامتِ تملیک، ہائفن (hyphen)، بریکٹوں (قوسین یا قلابین) کی مختلف شکلیں اور قسمیں بھی شامل کی ہیں۔ متن میں جملۂ معترضہ کے لیے جو بریکٹ یا داوین استعمال ہوتے ہیں انگریزی میں ان کا نام الگ ہے اور انھیں paranthesis کہتے ہیں بلکہ اس موضوع پر انگریزی میں لکھی گئی بعض کتابوں میں صرف بریکٹوں کی مختلف قسموں اور ان کے استعمال کے مختلف محل اور وجوہات بتائی گئی ہیں۔

اردو والے اس طرح کی ''خرافات'' سے بے نیاز ہیں، الا ماشاء اللہ۔ حالانکہ قرآن شریف کی قرأت میں علامات بہت اہم ہیں اور ان کو ملحوظ نہ رکھنے سے بعض صورتوں میں نہ صرف عربی عبارات بلکہ اردو میں بھی مفہوم تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس ساری تقریرِ غیر دل

پذیری کا منشا و مقصد صرف یہ یاد دلانا ہے کہ اردو میں رموزِ اوقاف کا استعمال بہت بعد میں شروع ہوا اور ہماری ان سے بے نیازی کا اب بھی وہی عالم ہے حالانکہ تحقیق کے جدید طریق کار (methodology) میں علائم و رموز کی بہت اہمیت ہے اور حواشی اور کتابیات میں بھی ان کے استعمال پر بہت زور دیا جاتا ہے، حتیٰ کہ کاما اور سیمی کالن اور کالن کے استعمال میں بھی فرق و تمیز کی تاکید کی جاتی ہے۔ شمس بدایونی صاحب نے ان پر خوب روشنی ڈالی ہے، ان کی تاریخ بھی منضبط انداز میں بیان کی ہے اور اردو میں ان کے استعمال اور اصولی مباحث پر بھی خاصی تحقیق کے بعد اہم نتائج اخذ کیے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ محض لکیر کے فقیر یا ناقل یا مرتب نہیں ہیں بلکہ انھوں نے اکثر مقامات پر رائج خیالات یا ماضی کے محققین سے اختلاف کیا ہے اور اپنی رائے قائم کی ہے۔ بعض رموز اس کتاب میں ایسے ہیں کہ کہیں اور ان کا ذکر شاید ہی ملے۔

ڈاکٹر صاحب کی محنت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اول تو اس موضوع پر بہت کم اردو میں لکھا گیا ہے اور جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اسے ڈاکٹر صاحب نے کمال اختصار سے سمیٹ لیا ہے اور ایک مثال کو چھوڑ کر یہ اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا کام ہے جس میں رموز اوقاف کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ لیکن وہ ایک مثال پاکستان میں مطبوعہ ایک غیر معروف اور گمنام سی کتاب ہے (اگر چہ وہ بھی محنت اور جستجو سے لکھی گئی ہے) جس تک رسائی اکثر پاکستانی محققین کی بھی نہیں ہے تو ظاہر ہے ہندستانی اہل علم کی کہاں سے ہوتی۔ لیکن کمال یہ ہے کہ انھوں نے وہ ساری اہم اور تاریخی معلومات اپنے طور پر بہم کر لی تھیں اور انھیں اس کتاب کے وجود کا علم بعد میں ہوا۔ یہ عاجز بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہے کہ شمس صاحب کی یہ کتاب اُس کتاب سے زیادہ جامع اور معیاری ہے۔ انھوں نے مختلف علامات اور نشانات کی فہرست اور ان کے مفاہیم و استعمال بھی اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ واضح کر دیے ہیں جس میں بعض نادر اور کم یاب علامات بھی شامل ہیں۔

راقم کو بھی اس موضوع سے خاصی دل چسپی رہی ہے اور کچھ ٹوٹا پھوٹا اس موضوع پر لکھا بھی ہے، کچھ مآخذ جمع بھی کیے اور مزید علامات و مخففات پر لکھنے کا ارادہ بھی تھا۔ لیکن یہ

دیکھ کر حیرت ہوئی اور مسرت بھی کہ شمس صاحب نے ان تمام علامات و اشارات کو بھی اس کتاب میں شامل کر لیا ہے جن کا ذکر یا تو کہیں نہیں ملتا یا بہت کم ملتا ہے۔ چنانچہ اک گونہ اطمینان ہوا کہ اب اس موضوع پر راقم کے پاس لکھنے کو کچھ نہیں رہا۔ کوئی اور آپ کے حصے کا کام کر دے تو اس سے اچھی بات بھلا اور کیا ہوگی۔ بقول کسی کا ہل خاتون کے، بھلا ہوا میری گگریا پھوٹی، میں تو پنیا بھرن سے چھوٹی۔ شمس صاحب کا شکریہ اردو دنیا تو ادا کرے گی ہی ہم سب سے پہلے ان کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ہمارا بوجھ بھی اٹھالیا۔

اس موضوع پر ان سے پہلے جن بعض حضرات نے لکھا ہے اس میں اگر تحقیق ہے بھی تو اس میں بلا سبب طوالت اور تکرار پائی جاتی ہے۔ شمس صاحب کی یہ کتاب تکرار اور بے جا طوالت کے عیب سے پاک ہے لیکن جامع ہے۔ اس جامعیت کی وجہ شمس صاحب کا مزاج ہے جو سراسر علم دوستی اور تجسس و تفحص سے عبارت ہے۔ عالم و محقق ہونے کے باوجود ہم جیسے طالب علموں سے بھی کچھ پوچھنے میں شرم محسوس نہیں کرتے (اور ہمیں شرمندہ کرتے ہیں) اور دل رکھنے کے لیے داد بھی دیتے ہیں لیکن شاید چپکے چپکے مسکراتے بھی ہیں کہ یہ سب تو پرانی باتیں ہیں۔ اگرچہ بہت کچھ جانتے ہیں لیکن انکسار کے پردے میں خود کو چھپائے رہتے ہیں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ انھوں نے اردو، عربی اور فارسی مخطوطات کے ماہرین سے بھی ان زبانوں میں رائج و مستعمل علائم و رموز و مخففات پر تبادلۂ خیال کیا اور اس طرح یہ کتاب اس موضوع پر ایک مستند اور جامع تصنیف بن کر سامنے آئی ہے۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

دیکھیں، اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

ڈاکٹر رؤف پاریکھ
(کراچی)

○

علامات-مخففات

اردو میں علامات، مخففات اور رموز اوقاف پر کوئی مستقل رسالہ یا کتاب (ہندوستان کی حد تک) موجود نہیں ہے۔ الگ الگ علم وفن کی اصطلاحات پر کتابیں لکھی گئی ہیں؛ لیکن ان تین اجزائے تحریر و کتابت پر توجہ نہیں دی گئی۔ عام طور پر انھیں اردو املا سے متعلق کر کے دیکھا گیا؛ حالانکہ فی نفسہ املا سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ غنیمت ہے کہ املا سے متعلق کتب میں ان پر بھی لکھا گیا اور ان کا کہیں اجمالی اور کہیں توضیحی تعارف کرایا گیا۔

○

تاریخِ علم و ادب میں علامات و مخففات کا ایک طویل سلسلہ نظر آتا ہے۔ عموماً موضوع اور اس کے متعلقات کے لحاظ سے ان کا انتخاب و استعمال کیا جاتا ہے۔ کچھ علامات و اشارات پہلے سے موجود ہوتے ہیں اور وہ ہر موضوع کے لیے قابل استعمال ہوتے ہیں؛ مثلاً رموزِ اوقاف اور بعض دوسری علامتیں۔ کچھ کا تعلق صرف کسی ایک موضوع سے ہوتا ہے؛ جیسے فلسفہ، تاریخ اور مذہب کے مخففات وغیرہ، کچھ کو کسی علمی منصوبے کے تحت وضع کیا جاتا ہے۔ بعض مصنفین نجی طور پر کچھ لفظوں اور حروف ونشانات کے خاص مفہوم طے کر لیتے ہیں اور ان کو اپنی تحریروں میں استعمال کرتے ہیں اور مقالہ و کتاب میں نمایاں طور پر ان کا اشاریہ بھی دیتے ہیں تاکہ مطالعے کے دوران قاری ذہنی خلجان کا شکار نہ ہو۔ انگریزی میں انھیں ABBREVIATIONS کہا

جاتا ہے؛ یعنی مخففات یا اختصارات۔

اداروں کی جانب سے منتخب علامات ومخففات میں ''اردو لغت تاریخی اصول پر'' کی مثال پیش کی جاسکتی ہے، جس کی پہلی جلد ۱۹۷۷ء میں اور آخری جلد ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئی۔ اردو لغت بورڈ کراچی کا یہ کارنامہ ۲۲ جلدوں کو محیط ہے۔ اس کی جلدوں میں اختیار کیے گئے اشارات ومخففات کا اشاریہ ہر جلد میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ اشارات ومخففات پانچ طور پر منقسم ہیں:

۱- اوقاف ورموزِ علامات کے تحت ۱۵؛ مثلاً: ختمہ، سکتہ، وقفہ، سوالیہ وغیرہ وغیرہ۔

۲- تلخیصات واشارات کے تحت اعراب وحرکات کے مخففات ۱۹؛ مثلاً فت = فتحہ، کس = کسرہ، ضم = ضمہ، شد = تشدید وغیرہ

۳- قواعد سے متعلق اصطلاحات کے مخففات ۱۳؛ مثلاً: مج = مجہول، مع = معروف، جج = جمع الجمع، ف ل = فعل لازم وغیرہ۔

۴- زبانوں کے ناموں کے مخففات ۲۰؛ مثلاً: پ = پراکرت، پر = پرتگالی، تر = ترکی وغیرہ۔

۵- متفرقات کے مخففات ۱۲؛ مثلاً: ح = حاشیہ، د = دیوان، ف = فعل، ک = کلیات وغیرہ۔

گویا ہر جلد میں تقریباً ۷۹ر اشارات ومخففات استعمال میں لائے گئے ہیں۔ ان میں جو متعارف ہیں، وہ زیرِ نظر کتاب میں شامل ہیں، باقی اس علمی منصوبے کا حصہ یعنی اختیاری شمار کیے جائیں گے۔

اردو کے بعض محققین نے انفرادی طور پر اپنے وضع کردہ مخففات بھی استعمال کیے، ان میں معروف نام قاضی عبدالودود (ف ۱۹۸۴ء) کا ہے۔ ۱۹۹۹ء میں خاکسار نے ان پر ایک مقالہ بہ عنوان: ''قاضی عبدالودود کا رویۂ تحقیق'' لکھا تھا جو ''یادگار نامہ قاضی عبدالودود'' (دہلی ۲۰۰۰ء) اور خاکسار کے مجموعۂ مقالات ''نقد واثر'' (دہلی

۲۰۰۴ء) میں شامل ہوا۔ اس مقالے کا ایک اقتباس تحقیق کے وسطی دور میں ان مخففات کے استعمال کی صحیح و غلط صورت حال کی کسی حد تک وضاحت کر دے گا۔ راقم الحروف نے لکھا تھا:

''اپنے مضامین میں وہ سائنس کی سی قطعیت اور ریاضی و قانون جیسی صراحت پیدا کرنے کے لیے اولاً زبان و بیان کو مختصر کرتے ہیں، پھر اس مختصر کا اختصار علامتوں اور نشانات کے استعمال سے کرتے ہیں۔ ان کے مضامین میں مخففات و اشارات کا ایک جال بچھا نظر آتا ہے جسے سمجھے بغیر ان کے مضامین سے استفادہ کرنا ناممکن ہے۔ انھوں نے اختر اورینوی کی کتاب ''بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا'' پر تبصرہ کیا تو ۵۹ مآخذ کو مخففات کی صورت میں نقل کیا۔ (ملاحظہ کریں سہ ماہی ''نوائے ادب'' بمبئی، اکتوبر ۱۹۵۹ء) قاضی صاحب کے معاصرین میں منجملہ محمود شیرانی کے، مخففات کے استعمال کا رواج نظر آتا ہے، مگر عمومیت کے ساتھ یہ متنی کاموں تک محدود تھا۔ قاضی صاحب نے انھیں مقالوں، مضامین اور مختصر ترین تحریروں میں بھی استعمال کیا۔ وہ حروف ابجد ہی کو استعمال نہیں کرتے بلکہ ریاضی کی بعض علامتیں بھی استعمال کرتے ہیں۔ وہ کبھی مضامین کے آغاز میں مخففات و اشارات کی فہرست دے دیتے ہیں، کبھی فٹ نوٹ میں؛ اور اکثر متن کے درمیان بھی ان کی صراحت کرتے چلتے ہیں۔ کتابوں کے ناموں کے عام طور پر وہ مخففات ہی استعمال کرتے ہیں؛ مثلاً: برہان قاطع (= برہان) قاطع برہان (= ق)۔ ''مآثر غالب'' میں انھوں نے حواشی کے لیے جو رموز استعمال کیے ہیں ان میں بعض تو کتابوں کے مخفف ہیں جو واضح ہیں؛ جیسے: برہان (= قاطع برہان) اردو (= اردوئے معلیٰ) وغیرہ۔ بعض صرف ایک حرفی دو حرفی و سہ حرفی ہیں؛ جیسے: ک (کلیاتِ نظمِ فارسیِ غالب) ک م (شمارہ ۴۴۴) ک م ا (مکتوبہ ۱۲۵۷ھ) ن ا (= ن کی نقل راقم کے پاس محفوظ ہے) یہ مخففات گمراہ کن ہیں۔ مخففات ان اسما یا الفاظ کے ہوں جو کثرتِ استعمال پر مبنی ہوں یا جن کا حوالہ بار بار آئے اور برائے تسہیل

ان کا مخفف اختیار کیا جائے۔ تحقیق کا تقاضا رمزِ نا معلوم کا تجزیہ کر کے حق تک پہنچنے کی کوشش ہے۔ اگر تحقیق میں ہی رمزیت آجائے تو وہ گمراہی ہے۔

انھوں نے حروف ابجد اور ریاضی کی علامتوں مثلاً (+) جمع، (-) نفی، (×) ضرب، (=) مساوی یا رموز او قاف جیسے: (؟) علامت استفہام (—) طویل ڈیش وغیرہ کا کسی مضمون میں کچھ مطلب لیا ہے اور کسی میں کچھ۔ اگر استقامت و مداومت کے ساتھ وہ ان حروف اور علامتوں کے مفہوم و مطلب مراد لیتے تو شاید یہ اردو میں رواج پا جاتے۔ جس طرح (ف) سے فوت، (م) سے المتوفی، (ق م) سے قبل مسیح (ص) سے صفحہ (ج) سے جلد مراد لیتے ہیں۔ علامتوں میں (ع) سے مصرع (سہ) سے شعر یا حوالہ نمبر (ــ) سے تخلص (ىجـ) سے نمبر شمار (ء) سے عیسوی (ھ) سے ہجری سمجھتے ہیں۔ یہ حروف و علامات اردو میں کثرت سے مستعمل ہیں اور اردو کے قاری ان کی بخوبی تفہیم کر لیتے ہیں۔ قاضی صاحب کے یہاں اکثر حروف و علامات مقطعات کی صورت اختیار کر گئے ہیں اور تحقیق میں مقطعاتی تحریر نادرست ہے؛ مثلاً:

حرف (م) متعارف و مستعمل ہے المتوفی کے مفہوم میں؛ لیکن یہ کہیں متداول کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کہیں مقدمہ کا مخفف قرار دیا جاتا ہے۔

حرف (ق) قلمی کے معنوں میں مستعمل ہے مگر (ق) لکھ کر قاضی صاحب قافیہ بھی مراد لیتے ہیں۔ حرف (ر) قاضی صاحب کے یہاں 'حروف ربط' کی نشان دہی کرتا ہے اور کہیں اس سے مراد 'رجوع' بہ ہے۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ قاضی صاحب نے کچھ حروف و علامات کو ایک ہی معنی و مفہوم میں بہ کثرت استعمال نہ کیا ہو؛ مثلاً: (ث) لکھ کر وہ ہمیشہ مؤنث مراد لیتے ہیں اور (ذ) لکھ کر مذکر۔ (ن) سے نسخۂ قلمی (ح) سے حاشیہ (ف) فعل (بس) سے بغیر سند (س) سے سند وغیرہ۔ (ا) ایک کے عدد سے غزل یا شعر کا نمبر شمار اور ۱/۶ لکھنے کی صورت میں اوپر کے ہندسے سے غزل اور نیچے کے ہندسے سے شعر مراد لیتے ہیں۔ ریاضی کی

علامتوں میں جمع کی علامت (+) سے عموماً تین مفہوم مراد لیتے ہیں۔ کسی امر کا اثبات قابل ترجیح، کثیر الاستعمال۔ علامت ضرب (×) سے بھی مطلق نفی اور کبھی طریق استعمال کی نفی مراد لیتے ہیں۔''

(نقد واثر، ص: ۶۸-۷۰)

مذکورہ بالا طویل اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انفرادی طور پر اختیار کردہ مخففات کسی بھی طور دوسروں کے لیے مفید مطلب نہیں ہو سکتے۔ جس علامت یا مخفف سے قاری واقف ہی نہ ہو، اسے استعمال کر کے دوسروں کے لیے مشکلات کا، کوہ گراں کھڑا کرنا ہے۔ متعارف علامات و مخففات کا استعمال ہی قاری کے لیے مفید مطلب ہو سکتا ہے، یا ایسے مخففات جن کی طرف ذہن بآسانی منتقل ہو جائے اور جو اپنی اصل سے پوری طرح نسبت رکھتے ہوں یا اس کا جز ہوں۔

ان مخففات کے استعمال کا مقصد متن کی ادائیگی میں سہولت اور مصنف کی محنت میں کفایت ہونا چاہیے اور یہ قاری کے لیے بھی سہل الفہم ہوں اور وہ اسے تکرارِ لفظ، جملہ اور عبارت سے بچنے کا وسیلہ سمجھتا ہو۔

○

لفظِ ''علامت'' کی جمع علامات ہے، جس کے معنی ہیں: نشانات، آثار، پتا، اشارات وغیرہ۔ تخلیقی ادب میں ایک خاص قسم کے اسلوب اور فنکارانہ رویے کو علامت نگاری (Symbolism) یا علامتی ادب سے موسوم کرتے ہیں۔ لفظ 'روایت' کی طرح اس لفظ کے معنی اور مفاہیم کی بھی کئی جہتیں ہیں۔ ادبی تحقیق میں جس طرح لفظ 'روایت' کے معنی مذہب و ادب سے مختلف ہیں (بمعنی شکل) اسی طرح لفظ 'علامت' کے معنی یہاں اصل کے مطابق نشان، شکل یا اشارے ہی کے ہیں؛ جیسے:

علامت سکتہ (،) سکتہ کا نشان، شکل یا اشارہ؛ علامتِ ختمہ (۔) علامت وقفہ (؛) علامت رابطہ (:) وغیرہ یا ریاضی کے نشانات، جن کو علامت کے سابقے کے ساتھ نقل

کیا جاتا ہے:

علامتِ جمع (+) علامتِ تفریق (−) علامتِ ضرب (×) اور علامتِ تقسیم (÷) وغیرہ۔ اعراب کو بھی علامت سے موسوم کیا جاتا ہے؛ جیسے؛ علامت مد، علامت تنوین، علامتِ تشدید، علامت ضمّہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ وہ الفاظ، ترکیبیں، نشانات، مخففات اور اعداد بھی اصطلاحی طور پر علامات کے زمرے میں آتے ہیں جو عرصۂ دراز سے عبارت کے درمیان میں آکر اپنے مفہوم سے عبارت کو رواں اور شگفتہ بناتے، طول بیانی سے محفوظ کرتے اور سریع الفہم بنانے میں ایک خاص کردار ادا کرتے ہیں؛ جیسے:

اِلخ، باسمہ، صلعم، رض، رک، لہٗ، منہٗ، ۱۲، ۷۸۶، ـــہ، ـــــ، ،، ...، ع، ص، ء وغیرہ۔

ان میں کچھ لفظی اور حرفی نشانات ہیں، کچھ اعداد اور نشانات پر مشتمل اشارے۔ ان سبھی کو علامات کہا جاتا ہے۔ یہ علامات تحریر وکتابت کے لیے ایک جز کا درجہ رکھتی ہیں؛ لیکن انھیں کبھی بھی اہمیت کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔

زمانہ کی رفتار کے ساتھ یہ علامتیں بھی بدلتی رہی ہیں اور ان کا استعمال بھی کم اور زیادہ، ہوتا رہا ہے۔ یہ متروک بھی ہوئی ہیں۔ ان میں کچھ علامتیں بہت زیادہ قدیم ہیں اور کچھ جدید بھی؛ لیکن ان سب کا تعلق رواج اور دستور سے رہا ہے، قواعدِ زبان وادب سے نہیں۔ علم وادب کے مختلف النوع موضوعات میں ان علامتوں کا پایا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ماضی میں ان علامتوں نے اپنے مصنفین کی تحریروں میں بار پایا۔ محدود طور پر ہی سہی اُن کے مطلوبہ مفاہیم کی ادائیگی میں حق رفاقت ادا کیا؛ گو وہ آج تک مرتب صورت میں جمع نہیں کی جاسکیں اور نہ ان کے استعمال کی عہد بہ عہد شکلوں کو نمایاں کیا گیا۔

○

مُخفّف جمع مخففات – لغوی معنی: تخفیف کیا گیا، گھٹایا گیا، کم کیا گیا وغیرہ۔ یعنی وہ لفظ، مختصر جملہ، ترکیب یا آیت وغیرہ، جس میں سے کوئی ایک یا چند حروف کم کیے

جائیں؛ جیسے: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا مخفف، باسمہ، اُلا آخرہ کا الخ، مصرع کا مخفف ع، جلد کا ج، صفحہ کا ص وغیرہ۔ مراد یہ ہے کہ مخفف کیے ہوئے لفظ، جملے، ترکیب یا آیت وغیرہ کی مختصر ترین صورت۔ انھیں حروفِ اختصارات بھی کہا جاتا ہے۔ ان جملہ مخففات یا اختصارات کو اصطلاحی طور پر ''علامات'' کہتے ہیں۔

ان علامات و اشارات کا واضع کون ہے، یہ بتا پانا ناممکن ہے۔ بعض لوگ اسے شارٹ ہینڈ رائٹنگ یعنی کتاب الرموز کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ جس کی تاریخ صاحب کشف الظنون کے مطابق عہد جالینوس تک جاتی ہے۔ ان کی نظر میں رموز القرآن اور رموز الکتاب اسی کا ثمرہ ہیں۔ (دیکھیے: السامیا، مشمولہ، قواعد صرف ونحوِ زبانِ اردو، ص:۱۱۴-۱۱۶) بعض لوگ انھیں ''اشارات مقررہ کاتبان'' قرار دیتے ہیں۔ (دیکھیے: معیار الاملا، ص:۸)

جو اپنی محنت اور تکرار الفاظ سے بچنے کے لیے ان کا استعمال کرتے تھے۔

ان دو نظریات سے الگ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ علمی و ادبی ضرورتیں خود ان کی واضع ہیں۔ انھیں کسی عہد یا افراد سے وابستہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ بعض علامتوں کے واضع کا اس طور علم ضرور ہو گیا کہ وہ پہلی بار اس مصنف کے یہاں مستعمل دیکھی گئیں؛ لیکن کسی بھی مصنف نے خود کو کسی علامت کے واضع کے طور پر پیش نہیں کیا۔ لہٰذا ان علامات کی تاریخ پر جو دبیز پردہ پڑا ہوا ہے اسے قیاسات کی بنیاد پر چاک کرنا کسی طرح سے بھی درست نہیں ہوگا۔

○

رشید حسن خاں (ف ۲۰۰۶ء) پہلے شخص ہیں جنھوں نے اعراب، علامات، مخففات اور رموزِ اوقاف کی اصولی تقسیم کی ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب 'اردو املا' (بار اول، دہلی ۱۹۷۴ء) میں ۱۷ مروج اور ۷ متروک علامتوں کی توضیح کی ہے۔

تحریر و کتابت میں مروج بعض علامتیں آج اصطلاح کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔

ان اصطلاحات، علامات اور مخففات میں جو معنوی اشتراک ہے، اس کے سبب مختلف مصنفین کے یہاں ان کی علیحدہ علیحدہ درجہ بندی کی گئی ہے۔ اس بحث سے قطع نظر خاکسار نے متعدد مآخذ سے کم وبیش ۵۰ لفظی، ۴۲ حرفی، ۷ عددی اور ۲۳ نشانات پر مشتمل کل ۱۲۲ علامات اور مخففات کو جمع کیا ہے، جن پر یہاں گفتگو مقصود ہے۔

پیش نظر مقالے میں علامتوں اور ان کے مخففات کو چار طور پر تقسیم کیا ہے:

لفظوں پر مشتمل علامتیں

حروف پر مشتمل علامتیں یا مخففات

اعداد پر مشتمل علامتیں

نشانوں (خط یعنی لکیر، نقطے وغیرہ) پر مشتمل علامتیں

○

لفظوں پر مشتمل علامات ومخففات:

ابجد: یعنی ا، ب، ج، د۔ یہ حروف اُس وقت علامتی مخفف کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں جب کسی مضمون یا بیان کو مختلف شقوں میں تقسیم کر کے لکھا گیا ہو۔ یہ حروف ہر شق کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اگر شقوں کی تعداد زیادہ ہو تو ہوز، حطی، کلمن الخ، تک حروف استعمال میں لائے جاتے ہیں: کبھی حروف کی جگہ اِن شقوں کے لیے نمبر کبھی نجم یا گول چوکور دائرے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔

اَز: یہ حرف ربط ہے، جس کے معنی ہیں: 'سے'۔ اردو میں یہ عموماً مرکبات کے ساتھ آتا ہے: ازخود، ازبس، ازبر، ازسرنو وغیرہ۔ کسی تصنیف وتالیف کی اس کے خالق سے نسبت ظاہر کرنے کے لیے بھی اس کا استعمال کیا جاتا ہے؛ مثلاً: حقائق وبصائر از راقم یا پنج آہنگ از غالب۔

اس لفظ کے ساتھ 'تا' بھی استعمال ہوتا ہے جس سے مدت یا ابتدا وانتہا بیان

کرنا مقصود ہوتا ہے؛ مثلاً: از آدم تا ایں دم (یعنی آدم علیہ السلام سے لے کرتا حال یعنی آج تک) از ابتدا تا انتہا (یعنی ابتدا سے انتہا تک)از مشرق تا مغرب (یعنی مشرق سے مغرب تک)

الخ ،اہ: اِلـیٰ آخِـرِہٖ کا مخفف ہے جس کا مطلب ہے، اس کے آخر تک۔ ہمارے بزرگ تکرار عبارت سے بچنے کے لیے کسی عبارت، شعر یا مصرع کو مکمل نہ لکھ کر اس کے ابتدائی لفظ لکھ دیا کرتے تھے اور اس کے معاًبعد الخ لکھ کر آگے بڑھ جاتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ یہاں مکمل عبارت، یا پورا شعر و مصرع مراد ہے۔ مقصود یہ ہوتا تھا کہ قاری یہاں پوری عبارت اور شعر پڑھے؛ مثلاً: ''مرزا نے اپنے شعر: ہے خبر گرم الخ، میں محبوب کے سامنے اپنی تنگ دستی کا شکوہ کیا ہے۔'' یہاں لفظ الخ قاری کو پورا شعر: '' ہے خبر گرم ان کے آنے کی ☆ آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا'' پڑھنے کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ اس کا ایک تلفظ، الف مفتوحہ اَلخ بھی ہے۔ ''اردو لغت تاریخی اصول پر'' میں الف پر زبر لگایا گیا ہے۔ آج کل ایسے مواقع پر الخ کی جگہ نقطے لگانے کا رواج ہو گیا ہے۔ اسے 'ا' اور 'ہ' سے بھی لکھتے تھے۔ یہ دونوں حرف الیٰ آخرہ کے اول و آخر ہیں۔ (دیکھیے معیار الاملا، ص:۸)

آلآیۃ: الیٰ آخر الآیہ کا مخفف ہے یعنی یہ آیت آخر تک پڑھی جائے۔ کسی قرآنی آیت کے ابتدائی الفاظ کا اندراج کر کے الآیہ لکھ کر اس سے پوری آیت مراد لینا، مثلاً: فبای آلاء الآیۃ؛ مراد ہے کہ ''فبای آلاء ربکما تکذبان' 'پوری آیت پڑھی جائے۔

اِنگ: مراد انگریزی زبان۔ لغات میں یہ مخفف استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ پرتگالی لفظ ہے، بہ کسرِ اول، آج کل یہ بروزن رَنگریز مستعمل ہے۔

ایضاً: لغوی معنی 'وہی' نیز 'یہ بھی' ہیں۔ وہی ہے جو اوپر لکھا گیا۔ حسب بالا، حسب

سابق۔ کسی اندراج کے بعد دوسرا اندراج بھی حرف بہ حرف پہلے ہی کے مطابق ہوتو ایضاً لکھ دیتے ہیں۔عموماً اس کا استعمال یکساں قسم کے بار بار آنے والے حوالوں، قیمتوں، کتابوں اور مصنفین کے ناموں کے اندراج یا فہرست میں کیا جاتا ہے۔ یہ قدیم علامت ہے (دیکھیے معیار الاملا، ص:۸) فرمان فتحپوری نے لکھا ہے: ''انگریزی میں ایضاً کی جگہ (Ditto) کا لفظ بولتے ہیں اور انگریزی میں اس کا نشان Do ہے۔'' (اردو املا اور رسم الخط، ص:۵۷)

بِاِسْمِہٖ: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا قائم مقام۔مسلمانوں میں ہر کام کا آغاز بسم اللہ پڑھ کر کیا جاتا ہے۔عبارت میں چونکہ اس کا لکھنا طولِ عمل سمجھا گیا؛ لہٰذا باسمہ کو اس کا مخفف مان لیا گیا۔شاہی فرامین میں بھی اس کا استعمال دیکھا گیا ہے۔اس کے آگے سبحانہ وتعالیٰ کا بھی اضافہ کر دیتے ہیں۔اکثر خطوط کے آغاز میں اسے لکھنے کا رواج ہے۔ڈاکٹر محمد انصار اللہ اپنے خطوط کا آغاز باسمہ علامت سے کرتے تھے۔

بَسْمِلَۃٌ: (بروزن تبصرہ) بھی اسی کا ہم معنی ہے۔اس لفظ کو اختیار کرنے میں ایک تصور یہ بھی تھا کہ چونکہ بسم اللہ الخ قرآن کریم کی آیت بھی ہے (سورۃ النمل، آیت: ۳۰) لہٰذا اس کی بے حرمتی نہ ہو۔اس کے اعداد نکالنا بھی اسی تصور کا رہین منت ہے۔بسم اللہ کے اردو معنی ''ابتدا'' مان لیے گئے ہیں، محاورہ ہے۔بسم اللہ کرنا، بسم اللہ سے تمت تک (یعنی ابتدائے کتاب سے اختتام کتاب تک) اردو لغات میں لفظ بسم اللہ ملتا ہے؛ لیکن باسمہ کا مذکور نہیں۔اصولی طور پر اس کے حرف اول 'ب' پر زیر آنا چاہیے؛ لیکن عربی میں یہ بسم اللہ کا مصدر ہے اور 'ب' پر زبر کے ساتھ مستعمل ہے، یعنی بروزن دبدبہ، زلزلہ وغیرہ۔اردو لغت تاریخی اصول پر کی ج/۲ میں اس کا اندراج ملتا ہے۔اس میں اس کے اردو میں دو تلفظ دیے گئے ہیں۔ایک بَسْمِلَۃٌ بروزن تبصرہ اور دوسرا بِسْمِلَہ دوسرے کو عوامی تلفظ لکھا گیا

ہے۔ گویا اردو میں اس قبیل کے جو لفظ مستعمل ہیں۔ بَسْمَلَہٗ، حَمْدَلَہٗ، سَلْعَلَہٗ ان کا تلفظ عربی اصول سے مختلف ہوگا۔

من لگن کا شعر ہے:

بسملہ مجھے کہے کہوں ہاں
میں بول اٹھا رحیم ورحماں

بیت: یعنی ایک شعر، جمع ابیات۔ یہ لفظ ماضی میں علامتِ شعر کے طور پر مستعمل رہا ہے۔ شعر لکھنے سے پہلے یہ لفظ لکھنا ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ خاکسار کی نظر میں اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اُس دور میں شعر کے دونوں مصرعے نثر کے ساتھ آمیز کر کے لکھ دیے جاتے تھے، بایں وجہ شعر کو ممیز کرنے کے لیے یہ لفظ لازماً لکھا جاتا تھا۔ بعد میں اس کی جگہ ایک نشان [سے] نے لے لی اور شعر بھی عبارت کے نیچے نئی سطر میں لکھا جانے لگا۔ شعرا کے دواوین میں ایک شعر یا متفرق اشعار کو بھی لفظ بیت اور ابیات عنوان کے تحت درج کیا جاتا تھا۔ دوہے کو بھی بیت کہتے تھے۔ بیت ہی کے ہم معنی لفظ فرد بھی استعمال ہوتا تھا۔ یعنی ایسا تنہا شعر جو کسی غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ وغیرہ کا جز نہ ہو۔

سرص: لفظ بَیاض کا مخفف۔ عرشی صاحب نے لکھا ہے:

"چند خطوں میں یہ علامت 'سرص' خط یا پیراگراف کے آخر میں لکھی ہے، جو لفظ بیاض کا مخفف ہے۔ یہ علامت بادشاہوں کے فرامین کے آخر میں بھی پائی جاتی ہے، جس سے غرض یہ تھی کہ آگے کوئی لفظ نہیں لکھا جا سکے، اور اگر کوئی لکھ دے، تو جعلی متصور ہو۔ رفتہ رفتہ نہ صرف کسی تحریر کے آخر میں بلکہ ایک پیراگراف کے ختم پر بھی بطور علامتِ خاتمہ لکھنے لگے۔" (مکاتیبِ غالب، ص: ۲۴۳)

گویا یہ علامت چیک پر لکھے جانے والے لفظ Only (صرف) کے ہم معنی ہے۔ وہاں بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ اس کے آگے کوئی اضافہ نہ کر سکے۔

یہ علامت خط شکست میں رہی ہوگی، جس میں نقطوں کو حذف کر دیا جاتا ہے۔اس میں لفظ بیاض کے تین حرف ب ی ض ہیں، جس کے معنی سفید کے ہیں۔طب کی اصطلاح میں آنکھ کی پتلی میں ہلکی سی سفیدی آجانے کی بیماری کو بھی بیاض کہتے ہیں، گویا اس علامت کے بعد سفیدی ہے یعنی اسے بنا تحریر کا تصور کیا جائے۔ ڈاکٹر عطا خورشید (علی گڑھ) نے اطلاع دی کہ محمد ولی اللہ فرخ آبادی (ف۱۸۳۳ء) کی تفسیر قرآن ''نظم الجواہر ونھد الفرائد'' (خطی) میں جا بجا جگہ چھوڑ دی گئی ہے جسے وہ پُر نہیں کر سکے ہیں اور خالی جگہ میں لفظ 'بیاض' لکھ دیا ہے۔ یہ خطی نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے حبیب گنج کلکشن میں موجود ہے۔مخطوطہ نمبر۱۴/۳ ہے۔

تا: اس لفظ کے معنی ہیں 'تک' یہ عموماً از کے ساتھ استعمال ہوتا ہے؛ لیکن بعض مواقع پر یہ تنہا بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ۱۸۲۲ء تا ۱۸۳۲ء، بچپن تا جوانی، یعنی ۱۸۲۲ء سے ۱۸۳۲ء تک، بچپن سے جوانی تک، مندر تا مسجد- مندر سے مسجد تک۔اس مفہوم میں ایک لفظ لغایت بھی استعمال ہوتا ہے، جو دو تاریخوں کے درمیان اُن کی درمیانی مدت کو ظاہر کرتا ہے۔مثلاً: مولانا آزاد ۹راگست ۱۹۴۲ء لغایت ۱۵رجون ۱۹۴۵ء قید و بند میں رہے۔

ترک/رکاب: 'ترک' کے معنی ہیں چھوڑنا، بھول چوک، سہو، کنارہ کشی، بک مارکر کو بھی ترک کہتے ہیں۔ ابتدا میں کتاب پر صفحہ نمبر ڈالنے کا رواج نہیں تھا، لہٰذا دوسرے صفحے کی آخری سطر کے نیچے بائیں جانب اگلے صفحے کی عبارت کے ابتدائی ایک دو لفظ لکھ دیے جاتے تا کہ قاری صفحات بے ترتیب ہو جانے کی صورت میں ان تک پہنچ سکے۔ یہ ہندسے کی جگہ کام دیتے تھے۔ اِنھیں الفاظ کو ترک کہا جاتا ہے۔اس کے لیے ایک لفظ رکاب بھی استعمال ہوتا ہے۔رکاب کے معنی ہیں زین کا حلقہ یا قدم، چونکہ قاری مطالعہ کے لیے اگلے صفحے تک ایک

نظری قدم اور بڑھاتا ہے اس لیے اسے رکاب کہا گیا۔علاوہ اس کے وہ عبارت جو لکھنے سے رہ جائے اور حاشیے پر لکھ دی جائے۔

سطر ابرو نہیں اس روئے کتابی پہ ظفر
ترک کاتب نے لکھی ہے غلطی کے باعث
(ظفر)

تعہ :تعالیٰ کا مخفف۔'اردو املا' کے مصنف غلام رسول نے اس کا اندراج کیا ہے۔ ڈاکٹر اجمل اصلاحی نے اس کے استعمال کی صورت سے مطلع فرمایا، کہ جہاں آیت لکھنی ہو وہاں قال لکھ کر یہ علامت اور پھر آیت لکھ دیتے ہیں۔مراد ہوتی ہے قال اللہ تعالیٰ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔میں نے اسے لفظ اللہ پر بھی دیکھا جس طرح حضور کے نام پر ؐ اور صحابہ کے نام پر ؓ بنا دیتے ہیں اسی طرح اللہ کے نام پر بھی یہ مخفف مستعمل رہا ہے اللہ تعہ

تمام شد: تمام ہوا، مکمل ہوگیا۔کسی کتاب کے اختتام پر لکھا جانے والا جملہ۔زمانہ قدیم میں تمام شد، ختم شد لکھنے کا رواج تھا۔دیوان غالب طبع اول دہلی ۱۸۴۱ء کے آخر میں تمام شد لکھا ملتا ہے۔

تمت : مستقل ایک لفظ ہے جس کے معنی ہیں اخیر، خاتمہ، انتہا۔قدیم کتب و مخطوطات میں کتاب کے خاتمہ کے بعد تمت، تمام شد یا تمت بالخیر یا تین بار تمت تمت تمت یا کشش دار تمت لکھ دیا جاتا تھا، جو متن کتاب کے اختتام کا عندیہ ظاہر کرتا تھا۔ڈاکٹر عطا خورشید (علی گڑھ) نے مطلع کیا کہ تمت کے علاوہ ''تم تم تم'' بھی لکھا کرتے تھے، کبھی صرف 'م' بھی تین بار لکھ دیتے تھے: ''م م م''۔ میری نظر سے اس کی کوئی مثال نہیں گزری۔

تنبیہ: لغوی معنی آگاہی، خبرداری، نصیحت، دھمکی وغیرہ۔مذہبی و درسی کتابوں میں ہدایات کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔مثل علامتِ فائدہ کے۔پہلے ایک

اصول، کلیہ یا بات نقل کی اور پھر تنبیہ لکھ کر اس سے متعلق ہدایات، شرح یا وضاحت نقل کر دی۔

جج: (جیم کا مرکز اور نصف جیم) جمع الجمع کے لیے؛ جیسے: رکن، ج ارکان، اراکین۔ جج۔ یہ علامت الفاظ سے متعلق کتب یا فرہنگوں میں استعمال کی جاتی ہے۔

جع: جواب عنایت ہو۔ یہ علامت بھی میری نظر سے نہیں گزری۔ یہ جدید علامت ہے۔

حامداً / ومصلیاً: یہ نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم کا مخفف ہے، جس کا مطلب ہے کہ خدا کی حمد اور رسول کریم پر درود پیش کرتا ہوں۔ مسلمان اپنی تحریر وتقریر کا آغاز حمدِ خدا اور نعتِ رسول سے کرتے تھے؛ لہٰذا اس رسم کو باقی رکھنے کے لیے یہ مخفف رواج دیا گیا۔ کاتب اور خوش نویس عموماً اپنی تحریر کے آغاز میں اس کا استعمال کرتے تھے۔

حد: قدیم مخطوطات اور کتب میں عبارت کے اختتام پر کئی مخففات لکھنے کا رواج تھا، ان میں سے ایک لفظ حد بھی ہے، جس کے معنی ہیں کنارہ، انتہا، اختتام یعنی یہ عبارت کی انتہا ہے، یہاں کامل وقف کر لینا چاہیے۔

حَمْدَلَہ: (بروزن زلزلہ) الحمدللہ کہنا۔ اردو میں بسملہ، حمدلہ، سجلہ اور سلعلہ کے سوا اسی قبیل کے کسی دوسرے لفظ کا استعمال نظر سے نہیں گزرا۔ عربی زبان میں یہ مصدر صناعی کہلاتے ہیں۔ چند دوسرے لفظ یہ ہیں: ہیللہ = لا الہ الا اللہ، حوقلہ = لاحول ولاقوۃ الا باللہ، طلبقہ = اطال اللہ بقائک وغیرہ۔ ان تمام مصادر کا تلفظ بروزن زلزلہ کیا جائے گا۔

خاتمہ: خاتمۃ الطبع یا خاتمۃ التحریر کا مخفف۔ کسی مصنف کی کتاب کے آخر میں کبھی کبھی مصنف لیکن اکثر ناشر کی جانب سے جو عبارت اضافہ کی جاتی تھی وہ خاتمہ کے

عنوان سے نقل کی جاتی تھی۔ مخطوطے پر جو عبارت کاتب کی طرف سے لکھی جاتی تھی وہ ترقیمہ کہلاتی تھی۔ آثار الصنادید طبع اول میں سرسید نے اس علامت کا استعمال کیا ہے اور رسالہ صرف ونحوِ قواعدِ اردو از صہبائی کے طبع سوم لکھنؤ میں ناشر نے۔ یعنی وہ عبارت جو تمام کتاب پر لکھی جائے۔

ختم شد: تمام شد، تمت کے ہم معنی۔

رحـ : راورح کا سر یا مرکز، یہ مخفف ہے رحمۃ اللہ علیہ کا۔ مطلب ہے اس پر خدا کی رحمت نازل ہو۔ دعائیہ کلمہ ہے۔ اولیا، صوفیہ اور علما و بزرگوں کے ناموں کے اندراج کے بعد احتراماً ان کے نام کے آخری حرف پر یہ علامت لگا دیتے ہیں۔ اسے 'ر' اور 'ہ' سے بھی لکھتے تھے۔ یہ دونوں حرف رحمۃ اللہ علیہ کے اول وآخر ہیں۔

رضـ : یہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا رضی اللہ عنہا کا مخفف ہے، جس کا مطلب ہے خدا ان سے راضی ہو۔ یہ دعائیہ جملہ عموماً صحابہ کرام اور ازواج مطہرات کے ناموں کے ساتھ ادا کیا جاتا اور لکھا جاتا ہے۔ یہ علامت بھی نام کے آخری حرف کے اوپر لکھ دی جاتی ہے: حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ۔

رکاب: یہ ترک کا ہم مفہوم ہے۔ فرہنگ اصطلاحات پیشہ وران ج/۴ میں لکھا ہے:
کاپی کے حاشیے کے آخری کونے پر آیندہ صفحے کا پہلا کلمہ جو بطور یادداشت لکھا جاتا ہے، کاپی نویسوں [یعنی کاتبوں] کی اصطلاح میں لنگر، پوٹ، ترک یا رکاب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ (ص ۲۲۱) ''اردو لغت تاریخی اصول پر'' میں بھی یہ چار لفظ ہم مفہوم لکھے گئے ہیں۔

رک: (رے، کاف) رجوع کنید یعنی رجوع کریں کا مخفف ہے۔
اگر کسی خاص علمی بحث، کتاب یا ماخذ کی طرف توجہ دلانا مقصود ہو تو رک کی علامت بنا کر اس بحث، کتاب یا ماخذ کا حوالہ مع صفحات نمبر لکھ دیتے ہیں؛ مثلاً:

(رک تلانده غالب ص:۱۱یارک مقدمہ دیوان غالب نسخہ عرشی ص ۲۷) آج کل اس کی جگہ ''دیکھیے'' لفظ لکھا جانے لگا ہے۔

سَبْحَلَہ: سبحان اللہ کہنا۔

سَلْعَلَہ: سلام علیکم کہنا۔

سم : بکرمی سمت کے لیے یہ علامت دیکھی گئی ہے۔

صَلْعَم: صلی اللہ علیہ وسلم (اللہ تعالیٰ ان پر اور ان کی آل پر رحمت وسلامتی نازل کرے) کا مخفف ہے۔ یہ پیغمبر اسلام کے نام کے ساتھ احتراماً لکھا جاتا ہے۔

عم/ء: علیہ السلام کا مخفف۔ جملہ پیغمبروں اور اماموں کے نام کے ساتھ استعمال ہونے والا دعائیہ کلمہ، جس کا مطلب ہے ان پر اللہ کی سلامتی ہو۔ بعد میں یہ مخفف صرف نصف عین (ء) تک محدود ہو گیا۔ آج کل اسی کا رواج ہے۔

فائدہ: قدیم کتب خصوصاً مذہبی اور نصابی کتب میں کسی تحریر کے آخر میں تنبیہ یا نوٹ کے طور پر جو عبارت لکھی جاتی تھی اسے فائدہ کہتے اور لکھتے ہیں۔ یہ علامت بھی بہ ظاہر منسوخ ہو چکی ہے؛ لیکن رشید حسن خاں نے اردو املا (طبع اول ۱۹۷۴ء) کے صفحہ ۱۵ پر اس کا استعمال کیا ہے۔ بعض کتابوں میں فائدہ کی جگہ لفظ تنبیہ بھی استعمال کیا گیا ہے۔

فقط: لغوی معنی صرف، محض، بس، کافی وغیرہ۔ مجازاً ختم تمام شد، تمت کے ہم معنی۔ قدیم مصنفین کے یہاں کتاب کے آخر میں اس کا استعمال کیا جاتا تھا۔ غالب کے خطوط میں اس علامت کا استعمال اکثر ہوا ہے۔ ماضی قریب میں خطوط کے اختتام پر اس لفظ کا استعمال عموماً دیکھا گیا ہے۔

قَبْ: مقابلہ کیجیے کا مخفف۔

کسی مضمون میں کسی بیان، کسی عبارت، کسی قول یا کسی حوالے سے مقابلہ کی ضرورت محسوس ہو تو اس بیان، عبارت، قول اور حوالے کے آگے قب لکھ دیتے

ہیں۔ یہ تدوین کی علامت ہے، جسے اب تدوین کی اصطلاح مان لیا گیا ہے۔انگریزی میں اس کے لیے لاطینی لفظ Confer کا مخفف cf استعمال ہوتا ہے۔یعنی دونوں مواد یا متن کو ایک دوسرے سے ملا کر یا قریب رکھ کر دیکھیے۔

کَبِیْکَج :بروزن نشیمن۔ یہ ایک عجیب علامت ہے، جس نے قدیم مصنفین کی کتابوں میں جگہ پا رکھی ہے۔علامہ جلال الدین سیوطی (ف ۱۵۰۵ء) کی کتاب 'بغیۃ الوعاۃ' میں اسے پہلی مرتبہ دیکھا۔اس کا ناقص الاول نسخہ 'القاموس' کے نام سے ریختہ آرگ پر موجود ہے۔

عربی وفارسی سے سفر کرتی ہوئی یہ علامت اردو میں آئی۔قلمی ومطبوعہ کتابوں کو کیڑوں سے محفوظ رکھنے کے لیے طلسمی عمل یا ٹوٹکے کے طور پر اس کا استعمال کیا جاتا تھا۔اردو لغت تاریخی اصول پر ج/۱۴ میں محض فرہنگ آصفیہ کا بیان نقل کر دیا گیا ہے اور اس کے استعمال کی کوئی مثال نقل نہیں کی گئی۔فرہنگ آصفیہ میں لکھا ہے:

(سریانی) اسم مذکر: حشرات الارض کے موکل کا نام۔جھینگروں کا بادشاہ۔ (اکثر کتابوں کے اوراق پر جہاں افشاں کرتے ہیں، یہ لفظ لکھ دیا کرتے ہیں، تا کہ کیڑوں سے محفوظ رہے۔چنانچہ پرانی کتابوں پر برابر یہ لفظ لکھا ہوا پایا جاتا ہے) (فرہنگ آصفیہ ج/۲،ص:۱۵۵۰)

اس علامت کا استعمال یائے ندائیہ [یا] کے ساتھ کیا جاتا ہے اور اسے تین مرتبہ لکھا جاتا ہے: یا کبیکج یا کبیکج یا کبیکج

صاحب فرہنگِ آصفیہ نے اس کے پہلے کاف پر زیر دیا ہے جو درست نہیں۔

معروف ناقد شمس الرحمٰن فاروقی (ف ۲۰۲۰ء) کی کتاب ''شعر شور انگیز'' ج/۴ (ترقی اردو بیورو دہلی، اول ۱۹۹۴ء) کے آخری صفحہ نمبر ۷۶۲ پر یک صفحی

خاتمۂ کتاب میں (بہ زبانِ فارسی) عبارت کی آخری دو سطریں اردو کی ہیں۔ عبارت کے اختتام پر قدیم علامتِ اوقاف ۱۲ کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ یہ خاتمہ خود فاروقی مرحوم نے قلم بند کیا ہے:

لکھا رہے سو برس تک جو لکھ جائے کوئے/ لکھنے ہارا باؤلا، سو گل گل مٹی ہوئے۔ یا کبیکج یا کبیکج یا کبیکج ۱۲

یہ دوہا عبارت کے طور پر لکھا گیا ہے۔ (مصرعۂ دوم میں 'سو' نکال دیں تو اس کا وزن درست ہو جاتا ہے) فاروقی مرحوم نے اپنی دو اور کتابوں (تنقیدی افکار، دہلی ۲۰۰۳ء، اور لغات روزمرہ، دہلی ۲۰۱۱ء) کے آخر میں بھی فارسی میں خاتمہ کی عبارت لکھی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کتاب کے آخر میں خاتمۂ کتاب کی عبارت لکھنے کو پسند کرتے تھے اور پھر سے اسے رواج دینا چاہتے تھے؛ لیکن یہ سلسلہ ان کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔

اس طرح کے ٹوٹکے مسلم معاشرے میں اور بھی جاری تھے۔ ماضی میں خط کے لفافے پر تین بار ''قطمیر قطمیر قطمیر'' لکھ کر حوالۂ ڈاک کر دیا جاتا تھا۔ تصور یہ تھا کہ اس طرح خط ضائع نہیں ہوگا اور مکتوب الیہ تک جلد پہنچے گا۔ لفظ قطمیر کے ایک معنی اصحابِ کہف کے کتے کے ہیں۔ اس ٹوٹکے میں یہی معنی مراد لیے گئے ہیں۔

کد: کد کے لغوی معنی 'گھر' ہیں۔ اطبا اپنے نسخوں میں متعدد دواؤں کا جو وزن لکھتے تھے اس وزن کے جوڑ کو یعنی کل دوا کے لیے کد کا استعمال کرتے تھے، مثل ۲؍رتی، ۶؍ماشہ، دو تولہ = کد......

کَذَا: اردو والے اسے ''کذا فی الاصل'' یا کذلك کا مخفف مانتے ہیں، جس کا مطلب ہے: ''اصل میں یہ اسی طرح ہے۔'' حالانکہ عربی میں 'کذا' اسی معنی میں مستقل لفظ ہے۔

کسی منقول متن میں کوئی لفظ، کوئی بیان، کوئی سنہ سمجھ میں نہ آئے یا اس کی صحت میں شبہ ہو یا اس میں کسی غلطی کا احتمال ہو تو اس لفظ، بیان، شعر اور سنہ کے بعد قلابین میں [کذا] لکھ دیتے ہیں تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ یہاں نقل کرنے والے کا کوئی قصور نہیں، اصل عبارت میں یونہی ہے۔ اس علامت کا استعمال زیادہ تر تدوین متن یا تصحیح متن میں ہوتا ہے۔

لعہ: لعنۃ اللہ تعالیٰ کا مخفف۔ یعنی اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

لہٗ ولہٗ: لہٗ کے معنی 'اُس کا' ولہٗ کے معنی ہیں 'اور اُس کا'۔ اس لفظ کا استعمال عام طور پر انتخاب اشعار کی بیاضوں اور مجموعوں میں کیا جاتا تھا؛ جہاں ایک ہی شاعر کا متفرق کلام نقل کیا جا رہا ہو۔ جیسے غزل کے بعد قطعہ اور رباعی یا ابیات تو ان کے شروع میں نام لکھنے کے بجائے لہ یا ولہ لکھ دیتے تھے تا کہ پڑھنے والا سمجھ لے کہ یہ کلام بھی اسی شاعر کا ہے۔ عرشی صاحب نے لکھا ہے کہ غالب اسے نثر میں بھی استعمال کرتے تھے۔ (مکاتیب غالب، طبع ششم، ص: ۲۳۴) نثر میں استعمال کی مثالیں شاذ ہیں۔ یہ علامت اب متروک ہو چکی ہے۔

مُث: یہ مونث کا مخفف ہے۔ عموماً یہ لفظ لغت میں استعمال ہوتا ہے، اگر کسی لفظ کی تذکیر و تانیث کا بار بار اعادہ مقصود ہو تو اس مخفف کا استعمال کرتے ہیں۔

مُذ: یہ مذکر کا مخفف ہے، یہ بھی لغت میں استعمال ہوتا ہے۔

مُص: مصنف کا مخفف۔

مص: مصدر کی نشاندہی کے لیے۔ یہ مخفف لغت میں استعمال ہوتا ہے۔

مطہ: مطلوب کا مخفف۔ لغوی معنی طلب کیا گیا، مانگا گیا، خواہش کیا گیا، مقصود وغیرہ۔ اس علامت کا استعمال میری نظر سے نہیں گزرا۔ قیاساً اس کا استعمال ایسے مواقع پر کیا جاتا ہوگا جہاں کسی بات یا خیال کا مقصود بیان کرنا ہو۔

مع: یہ ''مزید عبارت'' کا مخفف ہے۔ خط کے خاتمہ کے بعد جو عبارت خط میں پس

نوشت کے عنوان سے لکھی جاتی ہے، اس کے لیے یہ علامت مستعمل تھی۔ اب متروک ہو چکی ہے۔ یہ بھی انگریزی کے .P.S یعنی Post Script سے متاثر ہو کر وضع کی گئی ہے۔

مِنہٗ: مطلب اُس سے، اُسی سے۔ کسی کتاب، مقالہ یا تحریر میں کوئی شعر، مصرع، ترجمہ یا حاشیہ مؤلف کا ہو تو منہ لکھ دیتے ہیں۔

نحمدہ و نصلی: خدا کی تعریف اور رسول پر درود۔

وصہ :وصول کرنے کی علامت ہے۔ کسی شے کے وصول پانے کے بعد رسید کے طور پر دستخط کی جگہ ' وصہ ' بنا دیا جاتا تھا۔

(ولا) :(و، اور خط شکست میں مرقوم الف) ''ورق الٹیے'' کا مخفف۔ یہ علامت ترک اور رکاب کی جگہ استعمال کرنے کے لیے وضع کی گئی تھی؛ لیکن یہ رواج میں نہیں آسکی۔ اس اصطلاح میں الف خط شکست میں مرقوم ہے۔ خاکسار نے اسے اول ر پڑھا، بعد میں پروفیسر عبدالرشید نے مطلع فرمایا کہ یہ خط شکست میں لفظ الف ہے، ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ انگریزی اصطلاح P.T.O کے ہم معنی ہے۔ یہ جدید اصطلاح ہے۔

حروف پر مشتمل علامات:

ا: اِلٰہ کا مخفف، خط شکست میں مرقوم الف۔

ا: اردو زبان۔

ب: بِکَرْمی سَمَت: یہ ہندوستانی جنتری راجہ بکرماجیت کے دور کی یادگار ہے۔ قدیم کتب، دواوین کے تاریخی مادوں میں اس کا استعمال نظر آتا ہے۔ موجودہ دور میں ساہتیہ اکیڈمی دہلی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کی مطبوعات میں سالِ اشاعت کے عیسوی اندراج کے ساتھ بکرمی سنہ کا بھی اندراج ہوتا ہے۔

ت: کہیں ترجمہ کہیں تمثیل اور کہیں ترکی زبان کا مخفف۔شاذ وفات کے لیے بھی استعمال کی گئی ہے۔

پ: پیدائش کا مخفف کسی سوانحی تذکرے میں تاریخ پیدائش کا اگر ہر ترجمہ میں اندراج کیا جاتا ہے۔تو ہر بار لفظ پیدائش نہ لکھ کر صرف پ لکھ دی جاتی ہے، جس سے تاریخ پیدائش مراد ہوتی ہے۔عام طور پر یہ اندراج قوسین میں ہوتا ہے، مثلاً: شمس بدایونی (پ۱۹۶۱ء)

ث: کسی لفظ کی تانیث کے اندراج کے لیے۔

ج: جلد کے لیے جیسے خمخانۂ جاوید ج/۲، شعرالعجم ج/۴

ج: جمع کے لیے، لغت میں کسی لفظ کی جمع سے پہلے ج کا استعمال کرتے ہیں؛ جیسے: رقم، ج ارقام، کتاب ج کتب

ج،س،م،ف: ''جواب سے مطلع فرمایئے'' کا مخفف ہے۔ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے لکھا ہے:

> انگریزی میں جس جگہ .R.S.V.P لکھا جاتا ہے، اردو میں وہاں ج س م ف لکھ دیتے ہیں۔صاحب کیفیہ نے اس کے لیے جواب عنایت ہو کا مخفف 'جع' تجویز کیا تھا؛ لیکن مقبول نہ ہوا۔ج س م ف کا رواج ہو گیا ہے اور اب یہی لکھنا چاہیے۔(اردو املا اور رسم الخط، ص:۵۷) خاکسار کا خیال ہے کہ یہ علامت پاکستان میں بھلے ہی رواج میں ہو ہندوستان میں اس کا قطعاً رواج نہیں یا کم از میری نظر سے یہ مخفف نہیں گزرا۔

ح ب: حوالہ مابعد کا مخفف (املا نامہ طبع دوم میں اس مخفف کا مذکور ہوا ہے۔ص ۱۰۳)

ح س: حوالہ ماسبق کا مخفف (حوالہ سابق)

ذ: مذکر کے لیے

س/ج: یہ صرف لفظ سوال اور جواب کا مخفف ہے۔عموماً اس حرف کا استعمال انٹرویو یا

نصابی کتب کی مشقوں میں کیا جاتا ہے۔ بار بار لفظ 'سوال' لکھنے کے بجائے حرف 'س' اور 'جواب' کے لیے 'ج' کا استعمال کیا جاتا ہے۔

س: سطر کا مخفف ہے۔علمی وادبی کتابوں میں سطر کے مخفف کے طور پر یہ حرف استعمال کیا گیا ہے۔

س: سلمہ اللہ تعالیٰ کا مخفف۔یعنی اللہ تعالیٰ اس کو سلامت رکھے۔ یہ دعائیہ کلمہ ہے۔ خطوط میں یا ناموں کے آخر میں اس کا استعمال عام ہے۔اسی لیے اس کا مخفف وضع کیا گیا؛ لیکن یہ مخفف راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا۔

ش: شرح کا مخفف، 'ح' کو بھی شرح کے مخفف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

ش: شمسی سنہ کے لیے

ص، صـــ :صفحہ کے لیے، جیسے ص:۲۰۱، دیکھیے تلامذہ غالب ص ۲۰۱ یعنی تلامذہ غالب کا صفحہ نمبر ۲۰۱۔ جب جلد کے لیے ج استعمال کیا جائے تو لازماً صفحات کے لیے ص: ہی استعمال کرنا چاہیے؛ جیسے: ج/۳،ص ۲۲ یعنی جلد نمبر ۳ کا صفحہ نمبر ۲۲۔

اس کی ایک اور علامتی شکل ہے یعنی ص کا مرکز بنا کر لکیر کھینچ دینا صـــ ۔جلد کی ج کے ساتھ اس کا استعمال درست نہیں۔اگر تنہا اسے استعمال کیا جائے تو صفحہ نمبر کا اندراج اس کے اوپر کیا جائے گا،اس طرح تلامذہ غالب صـــ ۲۸ ، مالک رام نے ذکرِ غالب (طبع دوم ۱۹۵۰ء) میں اسے اس طرح بھی استعمال کیا ہے: صف یہ اس کے استعمال کی منفرد صورت ہے۔(ص ۸۶) صاحبِ اردو املا غلام رسول نے اسے مصرع کی علامت بھی قرار دیا ہے۔(ص:۴۹)

ص،ص ص،صص،ص ص: صفحہ کی جمع صفحات کے لیے یہ چاروں صورتیں مستعمل رہی ہیں اور ہیں؛ جیسے:اس کتاب میں ۴۷۸ ص ص ہیں۔ص ص: ۲۴۵ وغیرہ۔

ﷺ: یہ صلعم یعنی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخفف صورت ہے۔اسے صرف نام محمدؐ اور احمدؐ

کے آخر میں دال کے اوپر لکھا جاتا ہے یا لفظ حضرت، آنحضرت، حضور الفاظ کے آخری حرف پر۔

لفظ صاد کا مطلب ہے توثیق، تصدیق، منظوری۔ ماضی میں اس کا استعمال متعدد مواقع پر کیا جاتا تھا:

☆ کسی دعوت کی فہرست میں اپنے نام کے آگے [ص] بنا کر یہ تاثر دینا کہ دعوت کی اطلاع مل گئی ہے؛ گویا یہ اطلاع پانے کی علامت ہے۔

☆ اگر کسی عبارت، جملے یا شعر کو غلط یا زائد سمجھ کر قلم زد کر دیا ہو، نظرِ ثانی کے بعد اسے برقرار رکھنا منظور ہو تو اس پر بھی [ص] بنا دیتے تھے: یعنی یہ صحیح ہے۔

☆ گلدستوں اور بیاضوں میں پسندیدہ یا منتخب شعر پر [ص] بنا دیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی دو دو [صص] بھی بنا دیے جاتے ہیں، یہ زیادہ پسندیدگی کا پتہ دیتے ہیں۔ کبھی دو صاد مصرعوں کے بیچ میں بھی ص بنا دیتے ہیں۔ قدیم اساتذۂ سخن اپنی پسندیدگی کا اظہار اسی طرح کرتے تھے۔

☆ اساتذہ بچوں کے مشقی سوالات چیک کر کے صحیح کے نشان کے طور پر بھی ص بنا دیتے تھے۔

☆ بادشاہوں کے فرامین کے آخر میں بھی [ص] کی علامت ملتی ہے، جو دراصل تصدیق یا دستخط کی علامت ہے۔ ڈاکٹر عطا خورشید نے مطلع کیا کہ ''نواب آصف الدولہ مختصر دستخط INITIAL نصف صاد ص سے کرتے تھے۔ ان کے فرامین پر یہ انیشیل دیکھے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ حرف 'ص' اصل نسخے، صحیح اور صوابدید کے لیے بھی مستعمل تھا۔'' صاد کرنا اردو کا محاورہ بھی ہے جس کا مطلب ہے تصدیق کرنا یا منظوری دینا۔

☆ مخطوطوں میں اگر کسی لفظ پر [ص] بنایا گیا ہے تو تحشیہ میں وہی [ص] بنا کر اس لفظ کے قلم زد کرنے یا اس پر کسی اور لفظ کا اضافہ کرنے کی وضاحت کر دی

جاتی تھی۔

غرض کہ اس کے استعمال کی متعدد صورتیں رائج تھیں۔ دعوت ناموں کی فہرست پر [صح] بنا کر دعوت کی منظوری دینے کا رواج ابھی بھی بعض چھوٹے شہروں اور قصبوں میں رائج ہے۔

ع: مصرع سے ماخوذ ہے۔ عبارت کے بیچ میں جب کوئی مصرع آ جائے تو اس کو عبارت سے ممیز کرنے کے لیے یہ علامت، مصرع سے پیشتر استعمال کی جاتی تھی۔ اب اس کی جگہ کولن کا استعمال کیا جاتا ہے۔

ع : لفظ عربی کا مخفف ہے۔ لغات میں لفظ کے ماخذ کے طور پر عربی زبان کے لیے نصف عین [ء] کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ابھی بھی رواج میں ہے۔

ء: عیسوی سنہ کے لیے۔ سنہ ء

عم : علیہ السلام کا مخفف ہے۔ جملہ پیغمبروں اور اماموں کے ناموں کے آخری حرف کے اوپر یہ نصف عین (ء) لکھ دی جاتی ہے۔ یہ ابھی رواج میں ہے مثلاً: حضرت آدمؑ، یوسفؑ، حضرت امام حسینؑ۔ عم کا مخفف رواج میں نہیں آ سکا۔

ف: فائدہ کا مخفف (یعنی اہم بات، نوٹ وغیرہ) اردو میں اس حرف کا متعدد صورتوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن (ف ۱۹۲۰ء) کے ترجمۂ قرآن پر مولانا شبیر احمد عثمانی (ف ۱۹۴۹ء) نے جو تفسیری نوٹ لکھے ہیں، ان میں لفظِ 'ف' کا استعمال کیا ہے۔ یعنی ترجمہ کے جس حصہ کی تفسیر کرنا مقصود ہے، وہاں حاشیہ نمبر کی جگہ لفظ 'ف' اور اس کے شکم میں حوالہ نمبر درج کیا ہے۔ حاشیہ میں بھی اسی طور 'ف' اور اس کے شکم میں حوالہ نمبر دے کر تفسیری نوٹ لکھے ہیں۔ یہ 'ف' کا منفرد استعمال ہے:

فؔ فؔ فؔ وغیرہ

فرہنگ اصطلاحات پیشہ وران ج/۴ مرتبہ ظفر الرحمٰن دہلوی، ۱۹۴۱ء میں اس

کے استعمال کی ایک اور صورت نظر آئی۔ مثالیں نقل کرنے کے لیے اسے حوالہ نمبر کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور 'ف' کو خط شکست میں بغیر نقطہ لکھ کر اس کے شکم میں مثال نمبر ۱، ۲، وغیرہ لکھی گئی ہیں۔ جیسے: ف ف۲ ف۳

ف: فارسی کا مخفف۔ لغت میں لفظوں کے بارے میں جب یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ ان کا کس زبان سے تعلق ہے، اس وقت اس حرف کا استعمال کرتے ہیں، جیسے: اشک، ف۔

ف: لفظ 'فصلی' کا مخفف۔ فصلی تقویم مغلیہ دور حکومت کی یادگار ہے۔ اکبر کے دورِ حکومت میں یہ تقویم مال گذاری کی وصولیابی کے لیے وضع کی گئی تھی۔ اس کا دورانیہ جولائی سے جون تک بارہ ماہ پر مشتمل ہے۔
سنہ فصلی اور عیسوی میں پانچ سو نوے برس کا فرق ہے۔ اگر سنہ فصلی میں پانچ سو نوے جوڑ دیں تو عیسوی سنہ برآمد ہو جاتا ہے۔ شعرا کے قدیم دواوین میں کہیں کہیں فصلی مادہ تاریخ بھی مل جاتا ہے۔

ف: فوت کا مخفف ہے۔ اس کا استعمال عموماً قوسین میں کیا جاتا ہے۔ اس مخفف کو رواج مالک رام (ف ۱۹۹۳ء) نے دیا۔ انھوں نے اپنی بیشتر تصانیف میں اسی مخفف کا استعمال کیا اور اب یہ اردو میں خاصا مستعمل ہے۔ خاکسار بھی اسی حرف کا استعمال کرتا ہے۔

ق م: قبل مسیح کا مخفف ہے۔

ق: قطعہ کا مخفف۔ قدیم شعرا کے یہاں غزلوں کے بیچ یا آخر میں کبھی کبھی قطعہ بند اشعار شامل ہوا کرتے تھے، جنھیں ممیز کرنے کے لیے کبھی لفظِ قطعہ اور کبھی حرف 'ق' کا اندراج کر دیا جاتا تھا۔ میر کی کلیات میں یہ حرف جا بجا نظر آتا ہے۔ امیر اللغات ج/۱ میں علاماتِ مستعملہ کے تحت 'ق' کا اندراج کیا گیا ہے جس سے مراد قطعہ لیا گیا ہے۔ (ص ۵)

ق: ورق کا مخفف۔ اردو مخطوطات میں اس کا استعمال ملتا ہے۔ ڈاکٹر اجمل اصلاحی صاحب نے مطلع فرمایا کہ عربی زبان میں 'ق' کا استعمال صرف مخطوطات کے ورق ہی کے لیے کیا جاتا ہے، مطبوعات کے لیے نہیں۔ اردو میں مخطوطات اور مطبوعات دونوں کے لیے مستعمل ہے۔ املا نامہ (طبع دوم) میں 'ق' ورق کے لیے استعمال کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ (ص ۱۰۴)

ق ق: اوراق کے لیے (املا نامہ، دوم ص ۱۰۴)

ق: قلمی نسخہ کے لیے۔ یہ محققین کی اختیار کردہ علامت ہے۔

ق: قمری سنہ کے لیے۔ (بقول ڈاکٹر عارف نوشاہی)

ک: کذالک کا مخفف یعنی ایسے ہی۔ ایضاً کا قائم مقام۔

م: متن کا مخفف

م: متوفی کا مخفف، یہ بھی قوسین میں استعمال کیا جاتا ہے؛ مثلاً: رشید حسن خاں (م ۲۰۰۶ء)

م: مروجہ، متداول اور متبادل کا مخفف۔ گیان چند نے لکھا ہے:

نسخۂ حمیدیہ میں غزلوں کے متداول اشعار کے بیچ میں 'م' لکھا ہے جو مدون کے مطابق 'مروجہ' کا مخفف ہے۔ (تحقیق کا فن، ص: ۲۹۸)

ن: نسخہ کا مخفف عموماً قلمی نسخوں کے لیے مستعمل ہے۔ گیان چند نے لکھا ہے:

پرانا قاعدہ تھا کہ کسی مصرع کے اوپر 'ن' لکھ کر حاشیے میں اختلاف نسخ لکھ دیتے تھے اور اس کے اوپر بھی 'ن' لکھ دیتے تھے، مثلاً:

ابتدائے 'ن' عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

راہ ن دور عشق

اب اختلاف نسخ اس طرح نہیں دیے جاتے۔ (تحقیق کا فن، ص ۲۹۸)

و: وفات کا مخفف، اس کا تنہا استعمال کم دیکھا گیا ہے۔ عموماً پیدائش کی پ کے ساتھ قوسین میں اس کا اندراج کیا جاتا ہے، مثلاً مرزا غالب (پ ۱۷۹۷ء و ۱۸۶۹ء)

ھ: ہجری کا مخفف، سنہ ہجری کے لیے دو چشمی ھ۔ یہ سنہ کے آخر میں درج کی جاتی ہے۔ سـ ھ

ہ: لغت کے مخففات میں لفظ ہندی کا مخفف۔

اعداد پر مشتمل علامات:

اَرقام سیاقی: ارقام، رقم کی جمع ہے، سیاق بمعنی حساب، مراد حسابی اعداد۔ اردو کی قدیم کتب میں قیمت کا اندراج انھیں علامتی اعداد میں کیا جاتا تھا۔ کاروباری بہی کھاتے بھی انھیں علامتی رقوم میں لکھے جاتے تھے۔ یہ حساب واعداد کا ایک مستقل فن ہے جو پرانے تعلیمی نصاب کا حصہ تھا؛ لیکن آج اس کے جاننے والے نہیں رہے۔ آج سے نصف صدی پیشتر کی مطبوعہ کتب اور جریدوں میں ان کا استعمال دیکھا جا سکتا ہے۔ تحقیق کے طالب علم کو ان کا بھی شکل آشنا ہونا چاہیے۔ اس سلسلے کی کتب میں ''معلم الحساب''، مطبوعہ کانپور اور ''بچوں کا حساب'' مرتبہ نظامی بدایونی (بدایوں ۱۹۳۱ء) کا دیکھنا مفید ہوگا۔ ان علامتوں کا نمونہ حسب ذیل ہے:

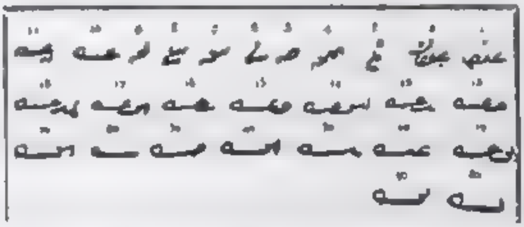

۱۲: حد کے عدد ہیں۔ (ح = ۸ + د = ۴ = ۱۲) یہ ہندسہ قدیم کتب میں عبارت کے خاتمہ پر لکھ دیا کرتے تھے جو قائم مقام فل اسٹاپ کے ہوا کرتا تھا، اب یہ

ہندسہ لکھنا متروک ہوگیا ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں یہ علامت عموماً حواشی میں استعمال کی گئی ہے متن میں نہیں۔ مرزا غالب یہ علامت پیراگراف کے آخر میں لکھا کرتے تھے۔ بارہ کے ہندسے کے ساتھ بارہ اماموں کا تصور بھی جڑا ہوا ہے۔ لفظ 'بارہ' کی ذیلی ترکیبوں میں ایک ترکیب 'بارہ امام' بھی ہے۔
غالب نے لطیفے کے طور پر اپنے شاگرد مہر کو لکھا تھا:

صاحب، بندۂ اثنا عشری ہوں۔ ہر مطلب کے خاتمہ پر بارہ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ (مکاتیب غالب، ص ۲۳۳)

بعد کے لوگوں نے غالب کے اس استعمال سے یہ نتیجہ اخذ کرلیا کہ بارہ [۱۲] کا ہندسہ شیعہ حضرات کی اختراع ہے اور وہ تبرکاً اس کا استعمال اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ تصور غلط ہے۔

۱۵: مولانا عرشی نے غالب کے خطوط میں جن علاماتِ اوقاف کا ذکر کیا ہے، ان میں پندرہ کا یہ ہندسہ بھی ہے۔ غالب کے سوا اس ہندسے کا استعمال اور کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ عرشی صاحب لکھتے ہیں:

''ایک خط میں صفحہ ختم ہوجانے کے باعث کچھ عبارت حاشیے میں لکھنی پڑتی تھی۔ اس کے ربط کی طرف اشارہ کرنے کے لیے انھوں نے (۱۵) کا ہندسہ متن کے آخر اور حاشیے کے شروع میں لکھا ہے۔'' (مکاتیبِ غالب، ص ۲۳۳، ۲۳۴)

گویا یہ ہندسہ انھوں نے پاورق میں حاشیے کی علامت کے طور پر استعمال کیا تھا۔ یہ علامت غالب کے مختارات میں شمار کی جانی چاہیے۔

۵: دورِ قدیم میں یہ علامت اردو میں ''وقف تام'' کے لیے مستعمل تھی، جو شکلاً پانچ کے ہندسہ کے مشابہ ہے۔ خاکسار کے پیش نظر مرزا محمد علی کی مؤلفہ کتاب ''قواعد زبان انگریزی'' (بہ زبان اردو) ہے۔ (مطبوعہ اکبرآباد ۱۸۶۶ء)

جس میں یہ علامت استعمال کی گئی ہے۔
قرآن کریم کے نظامِ اوقاف میں یہ مثل گول دائرے کے ختم آیت کی علامت ہے۔ میرے استفسار پر ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی صاحب نے مطلع فرمایا کہ اس علامت کا پانچ کی گنتی سے کوئی تعلق نہیں، یہ مشابہت اتفاقی ہے۔ اسے محض ایک قرآنی علامتِ وقف کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔
قرآن کریم کی حد تک یہ اصول درست ہے؛ لیکن اردو میں اسے شاید ہندسہ سے جدا کر کے دیکھنا ممکن نہیں ہوگا۔

۷۸۶: یہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے اعداد ہیں، عموماً کسی خط تحریر یا اشتہار کے شروع میں لکھے جاتے تھے۔ آج بھی انھیں لکھنے کا رواج ہے۔

۱۲منہ: راقم الحروف کی نظر سے یہ علامت نہیں گزری۔ مولانا غلام رسول مہر سے کسی نے بذریعہ خط اس علامت کی بابت استفسار کیا جس کے جواب میں انھوں نے لکھا:

''آپ نے غالباً ۱۲منہ پوچھا تھا، جس حد تک میرا ذہن مساعدت کرتا ہے ۱۲منہ کا قائم مقام (ی+ب) [ہے] دونوں کے عدد ۱۲ ہوتے ہیں۔ یب ''یہ بھی'' کا مخفف ہے، منہ کے معنی ہیں اسی سے، یعنی مصنف سے۔ مطلب یہ کہ یہ بھی مصنف ہی کی طرف سے ہے۔ یہ اس جگہ لکھا جاتا تھا، جہاں مصنف اپنی طرف سے کچھ اضافہ کرنا چاہتا تھا۔'' (گنجینہ، مہر ج/۱، مرتبہ محمد عالم مختار حق، لاہور ۲۰۰۸ء، ص ۶۰)

مولانا غلام رسول مہر کے علم وفضل کے اعتراف کے باوجود یہ لکھنا غلط نہ ہوگا کہ ۱۲ کے ہندسہ کو 'یب' کے عدد قرار دینا دوراز کار توجیہ ہے۔

۹۲: یہ لفظ محمدؐ کے اعداد ہیں۔ انھیں بھی ۷۸۶ کی طرح لکھا جاتا ہے۔ ۷۸۶/۹۲ لکھنے

کا ابھی رواج ہے۔

روایت ہے کہ بعض اہلِ تشیع ایک سو دس بتا بانوے اور پھر چھیاسٹھ لکھتے ہیں۔ ٦٦ عدد لفظ اللہ کے ہیں اور ١١٠ لفظ علی کے۔ نثر میں اس کی کوئی مثال نظر سے نہیں گزری۔ ہندو پاک کے آٹھ علمائے مذہب وادب سے ان ہندسوں کی بابت استفسار کیا، سبھی نے لاعلمی کا اظہار کیا البتہ بعض تاریخی مادّوں اور شعروں میں ان کا استعمال ملتا ہے۔ ڈاکٹر سید حسن عباس (بنارس) نے مرزا دبیر کی ایک رباعی بھیجی ہے، اس کا یہ شعر قابلِ ذکر ہے:

اعدادِ محمد و علی کو گن لو

١١٠ + ٩٢

یہ دونوں جو باہم ہوں تو رب ملتا ہے

٢١٠

نشانات پر مشتمل علامات:

ﺳـﮧ: یہ علامتِ شعر ہے، جو لفظ بیت کی مخفف صورت ہے۔ اب اس کا رواج ختم سا ہو گیا ہے۔ یہ حواشی کے نشان کی علامت کی صورت میں بھی لکھی جاتی ہے؛ مثلاً: کسی عبارت یا لفظ پر حاشیہ دینا ہو تو یہ علامت دے کر اس پر نمبر لکھ دیا جاتا ہے؛ بعد ازاں پاورق میں اس کا اعادہ کر کے اس پر حاشیہ دے دیا جاتا ہے؛ مثلاً: مالک رام[1] نے لکھا ہے۔

حواشی: [1] مالک رام ماہر غالبیات، تلامذہ غالب کے مصنف

عـﮧ: یہ علامت بھی قدیم ہے۔ عربی لفظ عشرہ کا مخفف۔ حاشیوں کے لیے اس کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اسے علامت حاشیہ کہہ سکتے ہیں۔ ارقام سیاقی میں یہ دس کا ہندسہ ہے۔ امیر اللغات ج/١ میں اس کا کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ ذکر غالب

(طبع دوم) میں بھی یہ علامت دیکھی جا سکتی ہے۔

ــــ :قدیم طرزِ تحریر و کتابت میں یہ علامت وقفِ کامل کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ عربی کے لفظ بَتْ (بمعنی کاٹنا) کی علامتی شکل ہے۔ خط شکست میں نقطے نہیں لکھے جاتے؛ لہٰذا لفظ بَتْ کو اگر بغیر نقطوں کے لکھیں تو یہی شکل بنتی ہے ــــ کثرتِ استعمال سے اس نے ایک مختصر لکیر کی شکل اختیار کر لی۔ ــــ

قدیم کتب میں یہ علامت، جملہ تمام ہونے پر لگائی جاتی تھی؛ لیکن اکثر جگہ خود غالب کے یہاں یہ جملوں کے شروع میں نظر آتی ہے۔ مولوی نظام الدین حسن نوتنوی کے اس بیان نے اس علامت سے متعلق التباس کو دور کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ــــ وقفِ کامل؛ علامتِ وقف کامل ہے۔ اس سے مقصد بَت ہے۔ عربی میں بَتْ کے معنی قطع کرنے کے ہیں۔

جہاں وقف کامل ہو وہاں مضمون جدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا علامت وقف تام کی، ــــ قرار دی گئی ہے۔ اور اس کو مخفف کر کے صرف ایک قلیل خط مُستوی اُفقی مابین دو فقروں کے لکھا جاتا ہے۔ کاتب کو جب مابین سطر میں وقف کامل کی علامت دینے کا خیال نہیں رہتا ہے تو بالائے سطر بھی 'ــــ' لکھ دیتے ہیں۔ اس سے بھی وہی مقصود وقف کامل ہے۔ (اوقاف العبارت، ص ۶۲)

اب یہ علامت متروک ہو چکی ہے۔ موجودہ ختمہ یعنی ڈیش (۔) کو اسی کی باقیات کہہ سکتے ہیں۔

// : علامت ایضاً۔ تنوین کے دو زبر کے مشابہ۔ جب یہ لکھنا ہو کہ اندراج ثانی سابقہ اندراج کے مطابق ہے تو اس کا استعمال کرتے ہیں۔ بدستور، حسب سابق، حسب بالا۔ اسی طرح کی ایک علامت انچ ظاہر کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ جب کبھی کسی قلمی نسخے یا کتاب کا سائز لکھا جاتا ہے تو

کبھی تو لفظ انچ لکھ دیتے ہیں، کبھی اعداد پر یہ علامت لگا دیتے ہیں؛ جیسے ''۷'' × ۵'' '' آج کل نسخہ کا سائز سینٹی میٹر میں لکھا جانے لگا ہے۔

=: علامت مساوی یا علامت تسویہ۔ Equal to، یہ ریاضی کی علامت ہے جس کا مفہوم ہے مساوی۔

اس کے استعمال کی حسب ذیل صورتیں ہیں:

اول کسی کتاب کا طویل نام کو لکھ کر اس کا مخفف مراد لینا۔ مثلاً قاطع برہان و رسائل متعلقہ = قاطع - مراد یہ ہے کہ جہاں جہاں لفظ قاطع لکھا جائے گا وہاں وہاں متذکرہ کتاب مراد ہوگی۔

کسی لفظ کی حیثیت برابر قرار دینے کے لیے مثلاً:

اُپر (= اوپر) ایدھر (= ادھر) اوس (= اس) کبھو (= کبھی) یعنی یہ سارے لفظ اصلاً ایک ہیں۔

+: علامت جمع۔ یہ بھی ریاضی سے لیا گیا نشان ہے۔ قدیم کتب میں یہ کاما کی جگہ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ فرہنگوں میں اس کا استعمال عام ہے۔ دو لفظوں سے مل کر جب کوئی تیسرا لفظ بنتا ہے تو اس صورت میں اس کا اندراج کرتے ہیں، مثلاً: سرورق = سر + ورق، زمیں وار = زمیں + دار، ڈاک خانہ = ڈاک + خانہ۔ اردو کی قدیم لغات میں اسے صلیب کا نشان لکھا گیا ہے۔ پنڈت کیفی دہلوی نے اسے وقف لازم یعنی ختمہ کی جگہ استعمال کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔

×: چلیپا، صلیب کا نشان۔ یہ لفظ شعروں میں زلف کی صفت کے لیے آتا ہے؛ زلف چلیپا یعنی پیچ دار و خم دار زلف؛ لیکن مجازاً اُس نشان کو کہتے ہیں جو کسی عبارت کی وضاحت کے لیے دیا گیا ہو۔ عموماً یہ نشان متن پر اور حوض کے باہر حاشیے میں دو جگہ استعمال کیا جاتا تھا۔ اسی نشان کے تحت ترچھی لکیروں میں عبارت مذکور کی تشریح یا تصحیح کی جاتی تھی۔ اس کی حیثیت علامت ص ص

کی سی ہے جس کا ذکر سطور گذشتہ میں آچکا ہے۔ یہی نشان علامت ضرب کا بھی ہے۔ کتاب کا سائز بیان کرنے کے لیے بھی اس کا استعمال کیا جاتا ہے؛ مثلاً:

تقطیع کتاب $\frac{۱۸\times۲۲}{۸}$ اور $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$ وغیرہ

⁂ : مولانا آزاد نے اپنے مضمون پنکچویشن (مشمولہ ارمغان آزاد، ص: ۱۹۰) میں حواشی کے نشانات کے ضمن میں ایک نشان یہ بھی دیا ہے۔ ممکن ہے یہ چلیپا ہی کی بدلی ہوئی شکل ہو۔

خاکسار نے اس کے استعمال کو حواشی کے نشان کے بہ طور نہیں دیکھا؛ البتہ حسب ذیل صورت میں یہ آج بھی مستعمل ہے اور خاکسار بھی اسے استعمال کرتا ہے۔

جس عبارت یا مضمون میں طویل اضافہ کیا جائے اس کے اختتامی لفظ پر یہ نشان لگا دیتے ہیں اور جو عبارت اضافہ کی جائے اس کی ابتدا میں یہ نشان لگاتے ہیں۔ عموماً یہ نشان کاتبوں کی رہنمائی کے لیے ہوتا ہے یا مسودے کو مبیضے میں منتقل کرتے وقت خود مصنف کے لیے یہ رہنما ہوتا ہے۔

⬅ : علامت تیر، یہ بھی کاتب کی رہنمائی کے لیے متن کے اس حصے پر لگایا جاتا ہے جس سے آگے کی کوئی عبارت متصل کرنا مقصود ہو۔

● : گول نشان یا نقطہ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے اپنے مضمون اردو املا کی تاریخ میں لکھا ہے:

''حضرت شیخ برہان الدین غریب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید شیخ رکن الدین ابن عماد الدین کاشانی نے تصوف پر ایک کتاب فارسی میں شمائل الاتقیا کے نام سے لکھی تھی۔ اس کا دکنی ترجمہ میراں یعقوب نے ۱۰۸۴ھ [۱۶۷۳ء] میں کیا۔۔۔ اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ فقرہ یا کلمہ وغیرہ کے ختم ہونے پر ہر

جگہ ایک بڑا گول (سرخ) نقطہ دیا گیا ہے؛ گویا اس زمانے سے ہماری زبان میں علاماتِ وقف نظر آتے ہیں۔ (معارف، اعظم گڑھ، جون ۱۹۵۱ء)

راقم الحروف کا خیال ہے یہ قرآن کریم کی علامت ہے، جو آج بھی گول دائرے کی شکل میں قرآن کریم میں نظر آتی ہے۔ ○ قرآن کریم کے رموزِ اوقاف میں اس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ ''حقیقت میں یہ گول ۃ ہے اور یہ وقف تام کی علامت ہے۔ اب ۃ نہیں لکھی جاتی چھوٹا سا حلقہ بنا دیا جاتا ہے، اس کو آیت کہتے ہیں۔''

/: آڑا خط، خط فصل: یہ نئی علامت ہے دو متبادلوں کو الگ الگ کرنے کے لیے یا دونوں کی تطبیق کے لیے اس کا استعمال کرتے ہیں؛ مثلاً: ۱۴۴۵ھ مطابق ۲۰۲۳ء میں لفظ مطابق کی جگہ اس لکیر سے کام لیا جاتا ہے۔ غالب ۱۲۱۲/ ۱۷۹۷ء، مرد/عورت، طالب علم/ طالبہ، بن/ بنت، اس کا استعمال دفتری اندراجات اور مراسلات میں بھی کیا جاتا ہے؛ مثلاً: خط نمبر ۲۳/الف/۲۰۲۳ء

دراصل یہ لکیر Oblique کے مشابہ ہے۔ اور اسی طرح استعمال ہوتی ہے۔

ر: ترچھی لکیر، یہ ایک مختصر سی ترچھی لکیر ہے جو کسی زمانے میں رقم، تاریخ اور وزن کے ہندسے کے بعد استعمال کی جاتی تھی، مثلاً: ۳ر (مراد تین آنہ) ۵ (پانچ روپے) ما ر (ایک سیر) ۱۲ر مارچ۔ اب اس لکیر کا استعمال محض تاریخ کے اندراج تک محدود ہے؛ مثلاً: ۳ر مارچ ۱۹۸۲ء، ۲۸ر اگست ۱۹۹۱ء

ــــ: علامت تخلص۔ شعرا کے تخلص پر ڈوئی کی شکل کی یہ علامت شعر کے متن سے تخلص کی الگ نشاندہی کر دیتی ہے؛ مثلاً:

زاغ کی چونچ میں انگور خدا کی قدرت
پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت

اس شعر میں شاعر نے اپنے تخلص کا استعمال کیا ہے؛ لیکن اگر تخلص پر علامت کا نشان نہ لگایا جائے تو یہ پتہ لگانا دشوار ہے کہ اس میں کون سا لفظ تخلص ہے۔ اس شعر میں زاغ بہ طور تخلص آیا ہے؛ اگرچہ معناً اس کا مفہوم کچھ اور ہے۔ اِن تخلص سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضرب المثل شعر محمد مبین نازش زاغ بدایونی کا ہے۔

یہ اشعار بھی دیکھیے:

پیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں
میں ہوں فانی صحیفہ باقی
حرف بے معنیِ فنا کی قسم

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مقطعوں میں شعرا کے تخلص پر یہ علامت لازماً لگانی چاہیے۔ قیاس ہے کہ یہ علامت ''بطور تخلص'' کا مخفف ہے۔ اس میں حرف 'ب' اور 'ت' کو بغیر نقطے کے پیش کیا گیا ہے۔ یہ بت سے منفرد علامت ہے گو شکلاً ایک ہی سی معلوم ہوتی ہیں۔

⋏ : علامت متروک یا خارجہ۔ اکثر مصنفین عبارت میں ترمیم و اضافے یا پروف پڑھنے کے دوران اس کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ لکیر الٹی Y کے مشابہ ہے۔ عبارت کے وسط میں جہاں کوئی لفظ اضافہ کرنا ہو تو وہاں یہ لکیر کھینچ کر اوپر وہ لفظ لکھ دیتے ہیں۔ یہ انگریزی Caret، ⌃ کی بدلی ہوئی شکل ہے۔

سنہ : سنہ عیسوی اور ہجری درج کرنے کی علامت، اب یہ بڑی حد تک متروک ہو چکی ہے۔

ع : یہ لفظ عدد کی ع کا سر ہے۔ یا لفظ نمبر کے ن اور م سے خط شکست میں مخفف بنایا گیا ہے۔ اس کو عدد یا شمار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے؛ مثلاً: مکتوب نمبر

ع۱ ع۲ ع۳

حاشیے میں بھی اسے حاشیے کا نمبر دینے کے لیے استعمال کیا گیا ہے:
بعض لوگ اسے لفظ نمبر کا مخفف قیاس کرتے ہوئے اس کے اوپر اور نیچے ایک ایک نقطہ بھی لگاتے ہیں۔ غبـ ''سفارشاتِ املا و رموزِ اوقاف'' میں اس پر نقطے دیے گئے ہیں۔ (ص: ۳۷) یہ علامت بھی اب متروک ہو چکی ہے۔

—: لکیر — افراد، کتب، مقامات کے نام نمایاں کرنے کے لیے لفظوں پر لکیر کھینچ دینے کا رواج قدیم مخطوطات میں ملتا ہے؛ بلکہ بعض مخطوطات میں اس لکیر کے لیے لال روشنائی کا استعمال کیا گیا ہے۔ قدیم مطبوعہ کتب اور لغات میں اس خطِ بالائی کا استعمال عمومیت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ قدیم مطبوعہ کتب اور لغات میں بھی اس خط بالائی کا اہتمام نظر آتا ہے۔ رشید حسن خاں نے بھی اپنی کتب میں ناموں پر لکیر دینے کا اہتمام کیا ہے۔ ڈاکٹر ٹی آر رینا، ابھی بھی اپنی مطبوعات میں اس لکیر کا اہتمام کرتے ہیں۔ آج کل کمپیوٹر کتابت میں ایسے مقامات کو بولڈ کر دیا جاتا ہے۔

— : خط کشیدہ، یہ لکیر لفظوں کے نیچے کھینچی جاتی ہے۔ (جدید علامت)

—: ایک لکیر ''اردو لغت تاریخی اصول پر'' کی ہر جلد میں مرکب لفظوں یا ایک ہی لفظ کے مختلف لاحقوں کے اندراج کے لیے استعمال کی گئی ہے۔ اسے انھوں نے سیدھا خط کا نام دیا ہے؛ فی الحقیقت یہ بڑی کارآمد ہے؛ مثلاً: ایک لفظ ہے تغافل اب اس لفظ سے بننے والے دوسرے الفاظ تغافل برتنا، تغافل پسند، تغافل پیشہ، تغافل شعار، تغافل شیوہ میں پانچ جگہ لفظ تغافل کی تکرار ہے۔ ایسے تمام مقامات پر — برتنا، — پسند، — پیشہ، — شعار، — شیوہ لکھا گیا ہے۔ پڑھنے والا ان مقامات کو از خود پُر کر لیتا ہے۔ اس طور اسے علامت تکرار یا خط تکرار کہہ سکتے ہیں۔

کبھی کبھی یہ لکیر تا یعنی تک کے قائم مقام کی حیثیت سے بھی کام کرتی ہے؛ مثلاً:

۱۹۸۴ء—۱۹۸۵ء یعنی ۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۵ء تک یا ۴—۸ یعنی چار سے آٹھ تک۔

... : نقطے جنھیں انگریزی میں three dots کہتے ہیں۔ ان کا اردو میں استعمال تین طرح سے ہے:

کسی شعر یا عبارت کے ابتدائی لفظ لکھ کر نقطے لگا دینا۔
یعنی اس سے مکمل شعر اور عبارت مراد ہے۔ یہ الخ کی جدید صورت ہے۔
کبھی عبارت کے شروع اور آخر کے لفظ لکھ کر درمیان میں نقطے دیے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے۔
کسی طویل عبارت کو مختصر کر کے لکھا جائے تو محذوف حصہ کی جگہ نقطے لگا دیے جائیں تاکہ پڑھنے والا یہ سمجھ سکے کہ عبارت کہاں کہاں سے چھوڑی گئی ہے۔
عبارت میں کوئی لفظ، بوسیدگی، کرم خوردگی کے سبب اگر پڑھنے میں نہ آسکے تو اس مقام پر بھی نقطے لگا دیے جاتے ہیں۔ البتہ اصل متن یا حاشیے میں یہ وضاحت کر دی جاتی ہے کہ عبارت کے ایسے تمام مخدوش مقامات پر نقطے لگانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

ؕ۵ : یہ فقط کی طغرائی صورت ہے۔ اصل میں یہ لفظ فقط ہے۔ غالب کے یہاں اس کا استعمال ہوا ہے۔ غالب پیراگراف کے آخر میں یہ علامت لکھتے ہیں۔

// : یہ جدید علامت ہے۔ جدیدیت کے فروغ کے زمانے میں (رسائل و کتب میں زیادہ سے زیادہ مواد کھپانے کے سبب) شعر اور مصرعے کو رواں عبارت میں پھر سے لکھنے کا رواج شروع ہوا۔ اس طور شعر یا مصرعے کو دو ترچھی لکیروں کے درمیان محصور کر دیا جاتا تھا؛ مثلاً:

''غالب کے بے شمار مصرعے ضرب المثل ہیں مگر یہ مصرع / نیند کیوں رات بھر نہیں آتی / سہل ممتنع کی خوبصورت مثال ہے۔'' اس دور کے بیشتر رسائل نے اس

طریق کو اختیار کر رکھا تھا۔

❖ ▪▪ : منشی غلام محمد نے اسے علامت منظومہ کا نام دیا ہے، یعنی ہر مصرعے کے آخر میں یہ نشان لگانا تا کہ نثر و نظم میں فرق کیا جا سکے؛ جیسے:

ہے خبر گرم ان کے آنے کی ▪▪ آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا ▪▪

ماضی میں عبارت کے درمیان آنے والے شعر یا مصرعے کو عبارت کے ساتھ پیوست کر کے رواں طور پر لکھ دیتے تھے، جس سے نثر و نظم میں تمیز کرنا دشوار تھا۔ چنانچہ شعر کے لیے علامتِ بیت [ـــہ] اور مصرعے کے لیے علامت عین [ع] وضع کی گئی۔ پھر تین نقاط اور چار نقاط کا استعمال بھی کیا جانے لگا۔ چار نقاط پر مشتمل یہ علامت اس عمودی پھول [❖] سے مشابہ ہے جو فل اسٹاپ کے طور پر جملے کے آخر میں لگایا جاتا تھا۔ آج کل شعر یا مصرع جاری عبارت کی سطر چھوڑ کر نیچے کی سطر میں نمایاں طور پر لکھا جاتا ہے۔

○

سطور گذشتہ میں دستیاب لفظی، حرفی، عددی اور نشانات پر مشتمل ۱۲۲ علامتوں اور مخففات کا مذکور ہوا۔ ان میں سے اکثر آج متروک ہو چکی ہیں یا ان کا بدل تلاش کر لیا گیا ہے۔ ۱۹۷۴ء میں ترقی اردو بورڈ دہلی کی املا کمیٹی نے ۱۵ (۱۹۹۰ء میں ۸ / کا اضافہ کیا) اور ۱۹۸۶ء میں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کی املا کمیٹی نے ۱۱ علامتوں کو استعمال کرنے کی سفارش کی تھی۔ گویا ان کی نظر میں یہ تعداد اس وقت کے اردو کے تحریری منظر نامے کے حسب حال تھی۔

(دیکھیے: املا نامہ طبع اول ۱۹۷۴ء اور سفارشاتِ املا و رموزِ اوقاف ۱۹۸۶ء)

راقم الحروف نے ان سفارشات پر غور کیا اور یہ پایا کہ حسب ذیل ۱۷ علامتیں آج بھی کسی نہ کسی درجہ میں استعمال ہو رہی ہیں۔ اتفاق یہ ہے کہ ۱۷ علامتیں وہی ہیں جو ہند و پاک کی املا کمیٹیوں کی تجویز کردہ ہیں۔ اس لیے راقم الحروف بھی انھیں حسب موقع و محل، عبارت میں استعمال کرنے کی تجویز پیش کرتا ہے۔ علامتیں اور رموزِ اوقاف عبارت و تحریر کا سامانِ آرائش ہے۔ انھیں صرف طول عمل سمجھ کر چھوڑ دینا یا ان سے فرار

اختیار کرنا مناسب نہیں۔ یہ ۷ اعلامتیں حسب ذیل ہیں:

لفظی علامتیں:

۱-اِلَخ : (دونوں کمیٹیوں سے منظور شدہ)

۲- رح : (دونوں کمیٹیوں سے منظور شدہ)

۳- رضؓ : (صرف املا کمیٹی اسلام آباد سے منظور شدہ)

۴- صَلعَم : (صرف املا کمیٹی اسلام آباد سے منظور شدہ)

۵- کَذا : (دونوں کمیٹیوں سے منظور شدہ)

حرفی علامتیں یعنی مخففات:

۶- ج : جلد کے لیے (املا کمیٹی دہلی سے منظور شدہ)

۷- ص : صفحہ کے لیے (املا کمیٹی اسلام آباد سے منظور شدہ)

۸- ﷺ : صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے (دونوں کمیٹیوں سے منظور شدہ)

۹- ع : مصرعے کی علامت (دونوں کمیٹیوں سے منظور شدہ)

۱۰- ؑ : علیہ السلام کے لیے (املا کمیٹی دہلی سے منظور شدہ، ۱۹۹۰ء)

نشانات پر مشتمل علامتیں:

۱۱- // : علامت ایضاً (دونوں املا کمیٹیوں سے منظور شدہ)

۱۲- ــــ : علامت تخلص (دونوں املا کمیٹیوں سے منظور شدہ)

۱۳- / : ترچھی لکیر (دونوں املا کمیٹیوں سے منظور شدہ)

۱۴- ـــ : خط بالائی ایسا خط جو ممتاز ناموں کو نمایاں کرنے کے لیے اوپر لگایا جائے۔
(املا کمیٹی دہلی سے منظور شدہ)

۱۵- ... : تین نقطے (املا کمیٹی دہلی سے منظور شدہ)

۱۶- ـــہ : علامت شعر و حوالہ (دونوں املا کمیٹیوں سے منظور شدہ)

۱۷- ـــــ: علامت حوالہ (دونوں املا کمیٹیوں سے منظور شدہ)

ترقی اردو بورڈ دہلی کی نئی املا کمیٹی نے ۱۹۷۶ء اور ۱۹۷۷ء میں بعدِ نظر ثانی بار دگر اپنی سفارشات مع اضافہ پیش کیں۔ یہ سفارشات ''املا نامہ'' کے نام سے گیارہ سال بعد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی ترتیب سے اسی ادارے سے ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئیں۔ جس میں حسب ذیل ۹ ر مخففات کا اضافہ کیا گیا۔

۱- ص ص : صفحات کے لیے

۲- ق : ورق کے لیے

۳- ق ق : اوراق کے لیے

۴- عم : علیہ السلام کے لیے

۵- ۱۲ : عبارت کے آخر میں لکھ دیا جاتا ہے، بمعنی ''حد'' حد کے عدد ۱۲ ہوتے ہیں

۶- رک : رجوع کنید، رجوع کیجئے، ماخذ کے حوالے کے لیے حواشی میں لکھتے ہیں۔

۷- ح س : حوالہ سابق

۸- ح ب : حوالہ مابعد

۹- حواشی کے اعداد: اس کے تحت علامت حوالہ دینے سے منع کیا گیا ہے۔ حوالوں کے نمبر سادہ طور پر لکھنے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔

(املا نامہ، دوم، ص ۱۰۳، ۱۰۴)

مذکورہ بالا سفارشات میں سوائے ۴، ۶ ر اور ۹ نمبر کے باقی علامات کا استعمال آج نہ ہونے کے برابر ہے۔ ○

تاریخِ رموزِ اوقاف (ماقبل و مابعدِ سرسید)

اردو نثر کو سائنسی میلان، عقلی رجحان اور مقصدی و افادی طرزِ بیان سے روشناس کرانے اور قدیم مسجع و مقفیٰ مبہم اُسلوب کے مقابلے ایک نئے سادہ، عام فہم مگر شگفتہ اُسلوب سے متعارف کرانے والوں میں سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) کا نامِ نامی سرفہرست ہے۔ سرسید کا مقصد محض علم و ادب کی خدمت کرنا نہیں تھا بلکہ ان کا ہدف اُس دور کا مسلم معاشرہ تھا، جس کی تہذیبی، تعلیمی، تمدنی، معاشرتی و مذہبی اصلاح و تربیت ان کا مطمحِ نظر تھا۔ انھوں نے اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے اصلاحی پروگراموں کے مختلف شعبوں پر وقتاً فوقتاً اظہارِ خیال کیا، تجاویز پیش کیں، منصوبے بنائے اور عملی اقدام کیے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے اپنی تحریروں کو پُر اثر، مفید مطلب اور وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے عربی ٹائپ کا استعمال کیا اور اس میں رُموزِ اوقاف کے استعمال کی راہ ہموار کی۔ برسہا برس سے کتابت کے اسیر معاشرے میں یہ ایک جرأت مندانہ قدم تھا، جو سرسید کے اصلاحی مشن سے بوجوہ میل بھی کھاتا تھا۔ ایک عجیب اتفاق یہ ہے کہ سرسید کے بعد بھی تحقیق کی اعلا ترین کتابیں ٹائپ ہی میں مرتب و شائع ہوئیں۔ میری مراد، مکاتیب غالب (اول ۱۹۳۷ء، از عرشی)، خطوط غالب (اول ۱۹۴۱ء، از مہیش پرشاد)، دستور الفصاحت (اول ۱۹۴۳ء ، از عرشی)، دیوان غالب (باراول ۱۹۵۸ء، از عرشی)، آئینۂ غالب (اول ۱۹۶۴ء،

مختارالدین احمد)، دیوان غالب (بار دوم ۱۹۸۲ء، از عرشی) وغیرہ سے ہے۔ مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور بھی ایک زمانے تک شعرا کے دواوین وکلیات، عربی ٹائپ ہی میں شائع کرتا رہا۔ انجمن ترقی اردو کراچی کا مجلّہ، سہ ماہی ''اردو'' انجمن اسلام بمبئی کا ''نوائے ادب''، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ''فکرونظر'' بھی ایک عرصے تک عربی یعنی نسخ ٹائپ میں شائع ہوا۔

ہر بڑا ادیب اپنے زمانے کے رواج ودستور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ کچھ چیزیں ان میں کم، کچھ پر اضافہ کرتا ہے اور کچھ کوئی جہت دیتا ہے۔ سرسید کے عہد میں توقیف نگاری کا رواج نہیں تھا۔ فورٹ ولیم کالج کی تصانیف میں بعض علامتوں کا استعمال ضرور تھا؛ لیکن سرکاری نصاب تعلیم کے مرتبین اور اس دور کے موقر مصنّفین کا اپنا اپنا طریقۂ کار تھا؛ اس انتشار کو دور کرنے اور اسے ایک معیاری، پسندیدہ اور مقبولیت سے ہم کنار کرنے کے لیے سرسید نے رموزِ اوقاف پر اپنی تجاویز ایک مضمون کی صورت میں پیش کیں اور 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' 'تہذیب الاخلاق' میں ان کے استعمال کو رواج دینے پر قوم کو متوجہ کیا۔

رموزِ اوقاف کی سلسلہ وار تاریخ اور رواج کو سمجھنے کے لیے سرسید کے اس مضمون کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوا۔ اس مضمون کی حسب ذیل اشاعتیں میرے علم میں ہیں:

۱- علاماتِ قرأت، تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، یکم رمضان ۱۲۹۱ھ [۱۲/اکتوبر ۱۸۷۴ء] پہلی اشاعت [ص: ۱۶۵ تا ۱۶۹]
۲- علاماتِ قرأت، اخبار سائنٹفک سوسائٹی/علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، علی گڑھ، ۱۶/اکتوبر ۱۸۷۴ء، دوسری اشاعت [ص: ۶۶۳ تا ۶۶۸]
۳- علاماتِ قرأت کے بارے میں سرسید کے خیالات، فکرونظر، علی گڑھ، ج: ۳، شمارہ: ۳ [جولائی] ۱۹۶۰ء، تیسری اشاعت

۴- علاماتِ قرأت، مشمولہ، مقالات سرسید، ج/ ۷، مرتب محمد اسمٰعیل پانی پتی، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، بار اول ۱۹۶۲ء [ص: ۲۱۶-۲۲۹]، چوتھی اشاعت

۵- علاماتِ قرأت [بہ صورتِ کتابچہ] مرتب مشتاق حسین، مطبوعہ آزاد کتاب گھر، دہلی، اول، ۱۹۶۴ء، پانچویں اشاعت

۶- علاماتِ قرأت، مشمولہ، منتخب مقالات، اردو املا و رموزِ اوقاف / مرتبہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی / مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۶ء [ص: ۱۶۷ تا ۱۷۹]

۷- علاماتِ قرأت، مشمولہ قواعد صرف و نحوِ زبان اردو، مولف: سرسید احمد خاں، مرتب: ابوسلمان شاہجہانپوری، ناشر ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان، کراچی، ۱۹۹۰ء [ص: ۱۰۰ تا ۱۱۳]

پانچویں اشاعت بہ صورتِ کتابچہ ڈیمائی سائز کے ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع کے آٹھ صفحات کتابی کوائف، انتساب (ص ۳) پیش لفظ (۵ تا ۸) کے لیے مختص ہیں۔ صفحہ ۹ تا ۲۴ پر اصل متن پیش کر دیا گیا ہے۔

راقم الحروف کے پیشِ نظر تیسری ۲ اور پانچویں اشاعت ۳ کے عکس ہیں۔ تہذیب الاخلاق اور اخبار سائنٹفک سوسائٹی کے شماروں میں بھی یہ مضمون نظر سے گزرا ہے؛ چونکہ ان کی فائل بٹر پیپر لگا کر محفوظ کر دی گئی ہے، لہٰذا اس کا صاف عکس حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ راقم الحروف نے حاصل شدہ عکس کا ملان 'اخبار سائنٹفک سوسائٹی' میں مطبوعہ مضمون سے کر لیا ہے۔ دونوں اشاعتوں پر بہ حیثیت مضمون نگار سرسید کا نام 'سید احمد' درج ہے؛ لیکن تیسری اشاعت مشمولہ فکر و نظر (علی گڑھ) میں سرسید کے نام کا اندراج فہرست اور مضمون دونوں پر نہیں۔ حاشیے میں لکھا ہے:

''یہ مضمون اگرچہ تمام تر سرسید کا لکھا ہوا نہیں ہے، لیکن اس موضوع پر انھوں نے جس بالغ نظری سے اظہارِ خیال کیا ہے اور اس کی اہمیت واضح کی ہے، نیز اسی طرح آج بھی یہ جس حد تک ہماری توجہ کا مستحق ہے، اُس کا تقاضا تھا کہ اسے منظرِ عام

پر لایا جائے۔''

(حاشیہ، فکر و نظر، شمارہ: ۳، ۱۹۶۰ء، ص ۹)

لیکن مضمون کے آخر میں لکھا ہے: راقم، سید احمد۔ ادارے کے اس جملے ''یہ مضمون اگر چہ سر سید کا لکھا ہوا نہیں ہے'' اور رسالہ کی فہرست اور مضمون کی لوح پر سر سید کے نام کا اندراج نہ کرنے کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ مضمون مشتاق حسین ہی کی تلاش و توجہ سے ادارے کو حاصل ہوا تھا۔ بادی النظر میں مذکورہ خیال مشتاق حسین ہی کا معلوم ہوتا ہے؛ لیکن پانچویں اشاعت میں اس کا مذکور نہیں۔

کتابچے یعنی پانچویں اشاعت کے پیش لفظ میں مشتاق حسین نے لکھا ہے:

''...لیکن یہ دیکھ کر بعض لوگوں کو تعجب ہوگا کہ سر سید نے سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعے جہاں مغربی علوم سے استفادے کی راہ کھولی، ترجموں کے ذریعے ہمیں نیا ذہن دینے کی کوشش کی، اور قدیم تصانیف کو ایڈٹ کر کے شائع کرنے کا سلیقہ سکھایا؛ وہاں ٹائپ کو باقاعدہ رواج دینے کا سہرا بھی سر سید ہی کے سر ہے۔ یہی نہیں بلکہ اردو تحریر کو سائنٹفک بنیادوں پر کھڑا کرنے کے لیے انھوں نے پنکچوئیشن کے مسئلے پر بھی غور کیا، اور انگریزی زبان سے استفادہ کرتے ہوئے اردو کی ضروریات اور اس کے مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے ایسی تجاویز پیش کیں، جو اپنے دور میں اجتہادی حیثیت رکھتی ہیں اور ان میں سے دو ایک کو چھوڑ کر تقریباً سب کی سب اردو میں رائج ہو گئیں، اور آج یہ 'علاماتِ قرأت' (پنکچوئیشن) ہماری اردو تحریر کا اس طرح جز بن گئی ہیں کہ شاید کسی کا ذہن بھی اس طرف نہ جائے کہ یہ کب اور کس طرح اردو تحریر میں داخل ہوئیں اور ان کے رواج کا سہرا کس بزرگ کے سر ہے۔ یہ مختصر سا رسالہ، اردو ادب کی تاریخ کے اس گوشے کو پہلی بار سامنے لا رہا ہے۔''

(علاماتِ قرأت: ۷ تا ۸)

مذکورہ بالا بیان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مرتب مذکور، اور دوسرے میدانوں کی

طرح اس میدان میں بھی سرسید کی اوّلیت کے قائل ہیں؛ لٰہذا ضروری معلوم ہوا کہ سرسید سے پیشتر اور مابعد 'رموزِ اوقاف' کی صورت اور اِن کے استعمال کی نوعیت و کیفیت پر تاریخی طور پر گفتگو کی جائے، اور اس میدان میں سرسید کی کارگزاریوں کی قدر و قیمت سے مطلع کیا جائے۔

فورٹ ولیم کالج کلکتہ [قیام ۱۰رجولائی ۱۸۰۰ء] سے پیشتر اردو میں توقیف نگاری پر غور وخوض کی مثال نہیں ملتی۔ قدیم مصنفین اپنی کتب میں عربی و فارسی میں مروج اس زمانے کی ضرورت کے مطابق بعض لفظی علامتوں کا استعمال ضرور کرتے تھے؛ مثلاً: ترک، فقط، تمت، خاتمہ، ولہٗ، الخ، تحشیہ، ضمیمہ وغیرہ؛ لیکن ان کا بھی التزام نہیں تھا؛ ظاہر ہے ان کی حیثیت رموزِ اوقاف سے جداگانہ تھی۔ ڈاکٹر جان گِل کرسٹ John Gilchrist (۱۷۵۹ء-۱۸۴۱ء) کالج کے قیام کے ساتھ ہی اُس سے بحیثیت ہندوستانی زبان کے پروفیسر وابستہ ہو گئے۔ انھوں نے کالج میں موجود طلبہ کے لیے ایک خاص نظامِ املا مرتب کیا، اور اس املا کو وہاں سے شائع ہونے والی کتب میں التزام کے ساتھ مستعمل کیا۔ انھوں نے املا پر ایک مستقل رسالہ بھی لکھا۵، جو بدقسمتی سے آج دستیاب نہیں۔ اس کا خلاصہ کالج کی جانب سے شائع ہونے والی میر شیر علی افسوس (ف ۱۸۰۹ء) کی کتاب 'باغِ اردو' (ترجمہ گلستانِ سعدی) طبع اول ۱۸۰۲ء میں اور حفیظ الدین کی کتاب 'خردافروز' (طبع اول ۱۸۰۴ء) میں بھی شامل ہے۔ رشید حسن خاں (ف ۲۰۰۶ء) کے پیشِ نظر یہ خلاصے رہے ہیں، جن کی بنیاد پر انھوں نے اپنی مدوّنہ 'باغ و بہار' کے مقدمہ میں اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''اس نے... ایک جامع نظامِ املا مرتب کیا تھا، پھر اُس سے بھی بڑا یہ کام کیا تھا کہ نہایت سختی کے ساتھ اور بہت التزام کے ساتھ مطبوعات میں اس کی پابندی کرائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ گل کرسٹ کی چھپی ہوئی (نستعلیق ٹائپ۶) کی کتابوں میں

ایک ہی نظام املا سامنے آتا ہے۔‘‘

(مقدمۂ باغ و بہار، ص ۸۵)

اس نظام املا میں ’ی‘ اور ’ؤ‘ کے استعمال کی چار قسمیں کی گئی تھیں: یاے معروف، یاے مجہول، یاے مشموم، یاے شوشہ دار۔ واوٗ معروف، مجہول، ماقبلِ مفتوح، اور معدولہ۔ ہر ایک کی پہچان کے لیے اس نے کچھ علامتیں مختص کی تھیں۔ (مثلاً: گول دائرہ، ۸ کے ہندسے کا دائرہ، کھڑے نقطے وغیرہ) اس زمانے میں ہندی حروف ٹ، ڈ، ڑ پر ’ط‘ کا اندراج نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ ت، د، ر ہی کی طرح لکھے جاتے تھے؛ سیاق و سباق سے قاری ان کا تلفظ کر لیتا تھا۔ غیر ملکی طلبہ کے لیے یہ صورتِ حال دشوار کن تھی؛ چنانچہ ِگل ِکرسٹ نے ٹ، ڈ، ڑ کے تلفظ کے لیے ت، د، ر پر چھوٹا سا خط [-] بنانا تجویز کیا۔ جیسے: مٹی کو متّی لکھا گیا ہے۔ عبارت میں جگہ جگہ پیراگراف بنائے گئے ہیں۔ کاما کے لیے چھوٹا خط [-] یعنی Hyphen اور فل اسٹاپ کے لیے کھڑا خط [۱] جسے انگریزی میں Vertical bar کہتے ہیں، ندائیہ [!] سوالیہ [؟] اور جملہ معترضہ کے لیے قوسین ( ) کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔

اس طور ’رموزِ اوقاف‘ کی تعیین اور استعمال کی جانب اردو میں یہ پہلا قدم تھا۔ بعد میں اس میں ترمیم و اضافے ہوتے رہے؛ اُس وقت تک توقیف نگاری کو املا ہی کا حصہ سمجھا جاتا تھا، اس کے لیے کوئی علاحدہ لفظ وضع نہیں ہوا تھا۔ بعد میں انھیں علاماتِ قرأت، نشاناتِ املا، اشاراتِ املا، اوقاف العبارت اور اوقاف قرأت بھی لکھا جانے لگا۔ ے

ِگل کرِسٹ کے بعد اس کا وضع کردہ املا کالج سے باہر کی کتابوں میں رائج نہیں ہو سکا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے:

’’اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں فورٹ ولیم کالج میں قواعد منضبط ہوئے، تو معروف ’ے‘ کے لیے ’ی‘، مجہول کے لیے ’ے‘، مخلوط ’ہ‘ کے لیے دوچشمی ’ھ‘

معین کی گئی؛ مگر دہلی تک ان قاعدوں کا اثر بہت دیر میں پہنچا اور غالب کے زمانے میں؛ بلکہ اس کے بہت بعد تک کوئی فرق ان حرفوں کی کتابت میں نہیں کیا جاتا تھا۔''
(مقالاتِ عبدالستار صدیقی، ج/۲، ص ۱۴۳)

ڈنکن فوربس [Duncan Forbes1798-1868] نے اپنی مدوّنہ 'باغ و بہار' (مطبوعہ لندن، ۱۸۴۶ء) کی ترتیب میں گِل کرسٹ کے املا کی پیروی نہیں کی۔ مثلاً فل اسٹاپ کے لیے اس نے بجائے کھڑا خط کے پھول کے نشان کا استعمال کیا ہے، (اور یہ پھول اتنا مقبول ہوا کہ آزادیِ ہند [۱۹۴۷ء] کے آس پاس کی کتابوں تک میں بالعموم اس کا استعمال نظر آتا ہے۔ (باقیاتِ شبلی، باراول ۱۹۶۴ء میں بھی اس کا استعمال دیکھا گیا۔ ص ۱۷) ٹ، ڈ، ڑ کے لیے بجاے چھوٹے خط [ـ] کے اُس نے اِن پر چار نقطے دیے ہیں۔ جن لفظوں میں الف لام لکھا جاتا ہے مگر پڑھا نہیں جاتا، اُن پر نصف ص [ص] کا نشان بنایا گیا ہے۔

۳ رمئی ۱۸۴۵ء کو شیخ امام بخش صہبائی (ف ۱۸۵۷ء) کا رسالہ بہ اسم ''رسالۂ قواعدِ اردو' پہلی بار ۱۲۶۱ھ/ ۱۸۴۵ء میں سرسید کے بھائی سید محمد خان کے چھاپہ خانہ 'سید الاخبار' یعنی لیتھوگرافک پریس دہلی سے چھپ کر شائع ہوا۔ اس کا دوسرا اڈیشن مطبع العلوم دہلی سے ۱۸۴۹ء میں اور تیسرا باسم ''رسالۂ صرف ونحوِ قواعدِ اردو' (صحیح: رسالۂ قواعدِ صرف ونحوِ اردو) مطبع منشی نولکشور لکھنؤ سے ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا۔ دوسرا اور تیسرا اڈیشن طبعِ اول ہی کے مطابق ہے۔

راقم الحروف کے پیشِ نظر یہی طبع سوم ہے۔ اس کے مقدمہ میں رموزِ اوقاف پر اصولی گفتگو کی گئی ہے۔ گل کرسٹ کے بعد پہلی مرتبہ کسی اردو مصنف نے ان پر اظہار خیال کیا۔ مقدمہ کُل نو صفحات (۴ تا ۱۲) پر مشتمل ہے، جس میں سے پانچ صفحات (۷ تا ۱۲) پر مراتب توقف اور مقام توقف واضح کرنے کے لیے انگریزی پنکچوئیشن کی علامتوں کو قدرے ترمیم کے ساتھ اردو نام دے کر دو قسموں میں منقسم کیا ہے اور ان

کے استعمال کی صورتیں واضح کی ہیں۔ اُن کی گفتگو کا ماحصل اُنھیں کے الفاظ میں یہ ہے:

علامات، قسم اول کی تین ہیں: یعنی ایک تھوڑے توقف کے واسطے حرف واو، اور اس سے دو چند توقف کے واسطے دو نقطہ بالائی یک دیگر، اور اس سے دو چند کے واسطے ایک خط۔ عرضِ اول کا نام واو، دوسرے کا زوج، تیسرے کا مد رکھا گیا۔ چنانچہ اسامی ان کی مع نشانوں کے یہ ہیں:

اسامی [نام]	علامت
واو	و
زوج	:
مد	ـ [اس ایڈیشن میں یہ علامت چھپنے سے رہ گئی]

علامت، قسم دوم کی بھی تین ہیں، یعنی اگر استفہام کا مضمون ہو اس کے واسطے نو کے ہندسہ کی صورت اور اس کے نیچے ایک نقطہ، اور اگر تعجب یا تہدید یا تحقیر یا اظہارِ رنجِ طبیعت یا مستعد کرنا کسی امر پر ہو، اس کے واسطے ایک خط طولانی اور اس کے نیچے ایک نقطہ، اور جملۂ معترضہ کے واسطے دو خط منحنی، ایک اول جملۂ مذکورہ کے اور دوسرا بعد اس کے۔ اول کا نام استفہام اور دوسرے کا فاصلہ، تیسرے کا حشو۔ ان کی اسامی مع نشانوں کے یہ ہیں:

اسامی [نام]	علامت
استفہام	؟
فاصلہ	!
حشو	( )

(رسالۂ صرف ونحوِ قواعد اردو، ص ۹،۸)

ان علامتوں کو اردو کتابت کے مزاج کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے اور اگلے صفحات میں ان کے استعمال کی مثالیں دے کر انھیں سمجھانے کی کوشش بھی کی

ہے۔مثلاً کاما جس کے لیے واو کو علامت قرار دیا گیا، اس کی مثال یہ دی ہے: ''میری بھلائی برائی رنج راحت سب تم پر واضح ہیں'' یہاں بھلائی، برائی، رنج اور راحت الفاظ کے نیچے واو [و] کا اندراج کر کے کاما کے استعمال کی صورت پیدا کی گئی۔آگے وضاحت کے ضمن میں انھوں نے اقتباس یا کسی خاص عبارت کو نمایاں کرنے کے لیے واو معکوس ['' ''] لکھنے کی ترغیب دی ہے۔کسی لفظ کو نمایاں کرنے کے لیے خط عرضی یعنی اس پر لکیر کھینچنے کی تجویز بھی پیش کی گئی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صہبائی نے انگریزی پنکچوئیشن کو باقاعدہ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ان کے انگریزی نام: ایکس کلیمیشن اور پرن تھیسس کا بھی مقدمے میں استعمال ہوا ہے۔

صہبائی کے درّاک ذہن نے انگریزی کی علامت استفہام پر بھی سوالیہ نشان قائم کیا ہے۔ان کے بقول استفہام تین طرح پر ہے: استخباری، اقراری اور انکاری؛ لیکن انگریزی میں صرف ایک ہی علامت استفہام [؟] ہے۔

صہبائی کی یہ کوشش تعارفِ رموزِ اوقاف کی جانب متوجہ کرنے کی پہلی روایت کے ضمن میں شمار کی جاسکتی ہے۔اگر وہ اس کتاب کے متن میں بھی ان ساری علامتوں کا استعمال کرتے تو یہ ایک مثالی کوشش ہوتی۔ اکثر ڈیش اور کاما کی جگہ جمع کا نشان [+] لگایا گیا ہے۔البتہ لفظوں کو نمایاں کرنے کے لیے بالعموم اوپر کھینچی گئی لکیر کا استعمال کیا گیا ہے۔نئے جملے کے شروع میں علامت بت [—] بھی استعمال کی گئی ہے۔

''صہبائی اور انگریزی رموزِ اوقاف'' کے عنوان سے خاکسار کا قدرے تفصیل مضمون ماہنامہ اردو دنیا، دہلی (دسمبر ۲۰۲۳ء) میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اس دوران انگریزی گرامر پر مشتمل بعض انگریزی کتب کے اردو ترجمے بھی ہوئے، جو عموماً آج نایاب ہیں۔اسی سلسلے کی ایک کتاب 'قواعد زبانِ انگریزی' مؤلفہ مرزا محمد علی (مطبوعہ مطبع نورالانوار، آگرہ ۱۸۶۵ء، ۱۸۶۶ء) کے اُن اوراق کا عکس ۸ پیش نظر ہے جن میں بہ عنوان ''خاتمۂ بیان اوقاف وعلامات قسم کلام میں'' کے تحت ۷،

علامات: کاما، (وقفِ ناقص) سیمی کولن، (شبیہِ وقفِ ناقص) کولن، (وقفِ متوسط) فل اسٹاپ، (وقفِ تام) نوٹ آف انٹروگیشن، (علامتِ استفہام) نوٹ آف ایکس کلیمیشن، (علامتِ حسرت، نداوتعجب وافسوس) ڈیش (علامتِ فصل ووصل) کا ذکر کیا گیا ہے، اوران کے استعمال کے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ (ص: ۳۴۵ تا ۳۵۹) آخر میں چنداور علامات کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب میں مسٹر ہیلز کی انگلش گرامر کے اکثر مضامین شامل کر لیے گئے ہیں؛ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ متذکرہ اوقاف کا کتاب کے متن میں کہیں بھی استعمال نہیں کیا گیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انگریزی کے مذکورہ بالا اوقاف اس وقت تک اردو میں رواج نہیں پا سکے تھے۔ ہاں ڈیش کی جگہ کہیں کہیں [۵] کے ہندسہ کا استعمال کیا گیا ہے۔۹

اس کتاب میں علاماتِ قرأت کے لیے پہلی مرتبہ ''اوقاف'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور چھ پنکچوئیشن کے اردو ترجمے بھی دیے ہیں۔ چار ترجمے قرآن میں اختیار کردہ اوقاف کے اردو ترجموں کے مطابق ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کی تصانیف کو اگر مستثنیٰ کر دیا جائے تو یہ کہنے میں کچھ تأمل نہیں کہ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۷۵ء تک تقریباً پون صدی سرکاری اداروں، اسکولوں کے نصاب تعلیم، آزاد مصنّفین کی کتب ورسائل میں توقیف نگاری کی طرف توجہ نظر نہیں آتی۔ راقم الحروف کے پیش نظر ۱۸۶۴ء کے نصاب تعلیم کی ایک کتاب 'جواہرِ منظوم' ہے۔ یہ کسی انگریزی نصاب کی کتاب کا نصاب اردو کے لیے منظوم ترجمہ ہے؛ ترجمہ نگار غلام مولا بخش قلق میرٹھی (ف ۱۸۸۰ء) ہیں۔ اس کتاب کو گورنمنٹ پریس الہ آباد نے پہلی بار ۱۸۶۴ء میں مرزا غالب کی اصلاح اور تائید کے بعد محکمۂ تعلیم کے دیباچے کے ساتھ شائع کیا تھا۔ کتاب میں توقیف نگاری اور علامات کے نام پر کچھ بھی نہیں؛ کاما اور فل اسٹاپ کی جگہ صرف ڈیش سے کام لیا گیا ہے۔ حاشیوں کے لیے علامتِ حاشیہ [ـہ] پر نمبر دیئے گئے ہیں؛ لیکن حاشیے پاورق میں نہیں بلکہ قدیم دستور کے

مطابق مارجن پر ہی ترچھے لکھے گئے ہیں۔ ہر حاشیے کے اختتام پر ۱۲ کا ہندسہ ہے، جو لفظ حد کے عدد ہیں۔ اشعار میں کہیں بھی، کسی بھی طرح کی علامت یا اشاراتِ املا کا استعمال نہیں کیا گیا ہے؛ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ توقیف نگاری سے عام طور پر واقفیت نہیں تھی اور اس کی ضرورت و اہمیت کا احساس اُس وقت تک عام نہیں ہوا تھا۔

۱۸۷۲ء میں بمبئی میں متوطن منشی غلام محمد۱۰(ف ۱۸۹۶ء) نے ایک رسالہ باسم ''رسالہ نجوم العلامات'' لکھ کر اردو میں توقیف نگاری کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اس میں انھوں نے قرآنی اوقاف کی طرز پر یعنی عربی حروفِ مفردہ کو بہ اضافہ خط زیریں (مثلاً و، ط، ف، ہ، ص) اردو میں استعمال کرنے کی سفارش کی۔ چند نشانی علامتیں بھی انھوں نے وضع کیں۔ انھوں نے از خود قرآنی اوقاف نظام کی طرز پر اردو کے لیے ایک نظام اوقاف مرتب اور شائع کیا۔ باوجودیکہ یہ اوقاف اردو میں رواج نہیں پا سکے، اس کی اہمیت اور اس کے مصنف کی سعی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اردو کے نظام اوقاف سے متعلق یہ پہلی مربوط و مفصل کوشش ہے جو ایسے شخص نے انجام دی جو انگریزی لکھنے اور بولنے پر قادر تھا؛ اور برسہا برس انگریزوں کو جس نے فارسی و اردو کی تعلیم دی اور تقریباً درجن بھر انگریزی و اردو کتب بھی اس کی مصنفہ ہیں۔

چونکہ یہ کتاب نادر و کمیاب ہے، خاکسار کو بھی کئی سال کی لگاتار کوششوں کے بعد اس کا عکس حاصل ہو سکا، اس لیے قدرے وضاحت سے اس کا تعارف کرا دینا مناسب ہوگا۔

رسالہ کا سرورق و صفحہ آخر پیش نظر ہے۔ یہ ۴۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ تاریخی قطعات کے مطابق سالِ اشاعت ۱۲۸۸ھ ہے جو مطابق ہے ۱۸۷۱ء، ۱۸۷۲ء کے۔ مطبع ہری بالنگو منبئی (بمبئی) سے چھپ کر شائع ہوا۔ شروع میں ۱۱ اردو و فارسی تقریظات ہیں۔ (۲ تا ۹) صفحہ ۱۰ پر تقریظ لکھنے والوں کا 'شکریہ' عنوان کے تحت شکریہ

ادا کیا گیا ہے۔ صفحہ ۱۱ پر بسم اللہ لکھ کر تمہیدی کلمات لکھے گئے ہیں، جس میں اوقاف نگاری کی اہمیت اور اس پر اپنے کام کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کتاب کے پانچ ابواب اور ہر باب کی فصلوں کی نشاندہی کی ہے جو حسب ذیل ہے:

باب اول: سبب تالیف کے بیان میں

باب دوم: علاماتِ اوقاف کے بیان میں

باب سوم: اشاریے اور ان کی تمثیل

باب چہارم: رسم خط کے بیان میں

باب پنجم: فوائد متفرقہ

ہر باب کو دو دو فصلوں میں منقسم کیا ہے۔ صرف باب چہارم چار فصلوں میں منقسم ہے۔

جن گیارہ علامتوں کو انھوں نے تجویز کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔ یہ ڈر تھا کہ شاید کمپیوٹر اِن علامتوں کو صحیح طور پر پیش نہ کر سکے، مگر کمپوزیٹر صاحب کی محنت نے اِسے ممکن بنا دیا:

و	علامتِ وقفہ	وقفہ کا مخفف مع خطِ زیریں	= کاما (،)
ط	علامتِ مطلق	مطلق کا مخفف مع خطِ زیریں	= (؛)
ہ	علامتِ آیت	آیت کا مخفف مع خطِ زیریں	= ختمہ (۔)
ف	علامتِ استفہام	استفہام کا مخفف مع خطِ زیریں	= (؟)
ن	علامتِ ندا، فریاد یا تعجب	ندا کا مخفف مع خطِ زیریں	= (!)
( )	علامتِ جملہ معترضہ		= قوسین ( )
ٌ ٌ	علامتِ اقتباس	تنوین کے دو پیش	= (“ ”)
خ خ	علامتِ خصوصیت	خصوصیت کا مخفف مع خطِ زیریں	
——	علامت اسم خاص	خط بالائی	= لکیر (—)

∴	علامتِ منظومہ	تین نقطے، شعر کے دونوں مصرعوں کے آخر میں
صِ	علامت وصل	وصل کا مخفف مع خطِ زیریں

علامت وصل یہ نئی علامت ہے، اس کی توجیہ انھوں نے یہ کی ہے: ''یعنی جب ایک لفظِ مرکب دو سطروں میں لکھا جاوے جو ہمیشہ ایک سطر کی آخر اور دوسری سطر کی شروع میں واقع ہوتا ہے تو اس کی پہچان کے واسطے پہلی سطر میں آدھے لفظ کے بعد علامتِ وصل لکھنی چاہیے؛ مثلاً ہنرص مند (ص ۲۳)

علامت خصوصیت (یعنی کسی اسم کو ممتاز کرنے کے لیے۔ انورٹڈ کاماز کا بدل) اور علامت منظومہ قدیم علامت کی توسیع ہے۔

انھوں نے وقفے کی حد بھی طے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یاد رہے، جہاں علامت وقفہ [یعنی کاما (،)] ہو وہاں ایک گننے [یعنی لمحہ بھر] تک اور علامت مطلق [سیمی کولن (؛)] کی جگہ دو گننے تک وقفہ کرنا اور جہاں جملہ تمام ہوتا ہے وہاں بالکل دم چھوڑ دینا پھر تازہ دم سے نیا جملہ شروع کرنا۔ (ص:۲۳)

انھوں نے کتاب کے مارجن میں حاشیے لکھنے کی مخالفت کی ہے اور پاورق میں حواشی لکھنے کی صلاح دی ہے۔ متن کے جس حصہ پر حاشیہ لکھنا ہے اس پر ڈوئی نما لکیر بنائیں ـــ اس پر نمبر دیں اور پاورق میں حاشیہ لکھیں اور متعلق نمبر اس حاشیہ کے اوپر دے دیں۔ اسی طرح ابواب بندی، پیراگراف بنانے، لفظوں کے درمیان فاصلے، املا سے متعلق بعض رموز، دوچشمی ھ کے استعمال اور انگریزی لفظوں کے متبادل، سماعی املا، شہر شہر علمی مجلسوں کے قیام وغیرہ سے متعلق بڑے اچھے مشورے دیے ہیں۔ وقفہ کے سلسلہ میں انھوں نے آٹھویں مثال کے تحت لکھا ہے کہ:

الفاظ: چونکہ، جیسا کہ، اس طرح کہ، اس لیے کہ، اس واسطے کہ، یعنی، غرض، الغرض، ورنہ، نہیں تو، فی الجملہ، حاصل کلام، پہلا، دوسرا، اگلا، پچھلا، برعکس یا برخلاف

اس کے، اولاً، آخراً، مثلاً، چنانچہ وغیرہ اور کبھی لفظِ 'کہ' کے بعد بھی علامتِ وقفہ [یعنی کاما] کیا چاہیے۔ (ص:۱۴)

صحیح بات تو یہ ہے کہ گفتگو میں ہم ایسے الفاظ کے استعمال کے بعد ہی قدرے توقف کرتے ہیں؛ لہٰذا یہاں سکتہ یعنی کاما دینے کی صلاح بہت مناسب ہے؛ لیکن مولوی صاحب اوران کی اتباع میں دوسرے لوگوں نے ایسے تمام ''اقسام حروف'' سے پہلے سکتہ لگانے کا مشورہ دیا ہے اور وہی رواج میں بھی ہے۔ غالباً یہ تحریر اور تقریر کے مابین فرق کا نتیجہ ہے۔ اوقاف سے متعلق بحث صفحہ ۱۵ سے ۲۳ کو محیط ہے، باقی صفحات میں اس دور کے حسب حال بڑی کارآمد باتیں ہیں، جن سے اس دور میں اصلاحِ تحریر وکتابت کی کوششوں کا پتہ چلتا ہے۔

صفحہ نمبر ۳۵ پر کتاب ختم ہوگئی ہے۔ بعد کے صفحات صفحہ ۳۶ تا ۴۰ پر دس فارسی و اردو، تاریخی قطعات ہیں، دو قطعات مصنف کے بھی ہیں، ان تمام قطعات سے سال اشاعت ۱۲۸۸ھ برآمد ہوتا ہے، جو مطابق ہے ۷۲-۱۸۷۱ء کے۔ صفحہ ۴۱ پر اشاریہ عنوان کے تحت صرف خط نستعلیق میں لکھنے کی سفارش کی گئی ہے۔

منشی غلام محمد (۱۸۲۴ء-۱۸۹۶ء) انجمنِ اسلام، بمبئی (قیام ۱۸۷۴ء) کے بنیاد گزاروں میں تھے، انجمن کے پہلے سکریٹری (۱۸۷۴ تا ۱۸۷۵ء) بھی رہے۔ تعلیم وتدریس شغل رہا۔ نووارد انگریزوں کو اردو و فارسی کی تعلیم بزبانِ انگریزی دیتے تھے۔ ان کی تصنیفات وتالیفات سول وملٹری امتحانات میں ایک عرصہ تک رائج رہیں۔

۱۸۸۲ء میں انھیں خان بہادر کا خطاب ملا اور ۱۸۸۶ء میں وہ بمبئی یونیورسٹی کے فیلو اور ممتحن بنائے گئے۔

انھوں نے ایک ہفتہ وار اخبار 'اردو انسٹرکٹر' ۱۸۸۲ء میں اور ایک ماہوار اخبار 'پرشین ٹیچر' بھی جاری کیا تھا۔

ڈاکٹر میمونہ دلوی نے ان کی درجن بھر تصانیف کی فہرست دی ہے؛ لیکن یہ تمام

نایاب ہیں۔ (بمبئی میں اردو، ص ۱۳۵-۱۳۶)

منشی غلام محمد کا سب سے بڑا کارنامہ اردو اوقاف کے لیے مخففات و نشانات وضع کرنا ہے، گو وہ اردو میں رواج میں نہیں آسکے؛ لیکن ان کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

یہی کتاب سرسید کے لیے علاماتِ قرأت پر مضمون لکھنے کی محرک بنی۔ باوجود اس کے کہ سرسید نے 'رسالۂ نجوم العلامات' کی اہمیت اور قدر و قیمت کا دل کھول کر اعتراف کیا ہے؛ لیکن انھوں نے اس پر زبردست تنقید بھی کی ہے؛ اس کا بھی اظہار کیا ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں، وہ اسی کتاب کی خوشہ چینی ہے۔ خوشہ چینی کا لفظ سرسید نے بہ ظاہر از راہِ انکسار استعمال کیا ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ انگریزی پنکچویشن کو اردو میں استعمال کرنے کے ایک مبسوط خاکے اور مثالوں تک اس کتاب کے مطالعے ہی سے پہنچ سکے۔ خود اس کتاب کو بھی انگریزی پنکچویشن کے اثرات سے بے نیاز نہیں کہا جاسکتا۔

منشی غلام محمد اور سرسید دونوں ہی نے دو دو سال کے غور و خوض کے بعد رموزِ اوقاف پر اپنی سفارشات و تجاویز قلم بند کی تھیں، اور اردو اوقاف کے، نئے نظام کے طور پر انھیں متعارف کرایا تھا۔ اِس طور یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ، گل کرسٹ کے بعد توقیف نگاری کو نئی زندگی دینے کی کوشش سرسید نے کی۔ ان کی یہ کوشش بایں طور بارآور ہوئی کہ بعد میں ان کی تجویز کردہ اکثر علامتوں کو من و عن قبول کرلیا گیا۔ سطورِ ذیل میں سرسید کے زیرِ بحث مضمون کے وہ حصے نقل کیے جارہے ہیں جن میں انھوں نے 'رسالۂ نجوم العلامات' پر تنقید کی ہے اور توقیف نگاری کے لیے اپنی تجاویز پیش کی ہیں۔ سرسید لکھتے ہیں:

ہم کو جناب ممدوح کی تمام تجویزوں سے دل سے اتفاق ہے، مگر جو علامتیں انھوں نے مقرر کی ہیں، ان سے بہ وجوہاتِ مفصلۂ ذیل ہم کو اختلاف ہے:

اوّل ــــ ہم نہیں پسند کرتے کہ جو علامتیں مدت سے قرآن مجید کی تحریر میں مخصوص ہوگئی ہیں، وہ اور تحریروں میں مروج کی جاویں اور 'آیت' اور 'مطلق' جو خاص قرآن مجید

کی اصطلاحات ہیں، اور تحریروں پر بولی جاویں، گوشرعاً وعقلاً اس میں کچھ قباحت نہ ہو، الّا تعظیماً للقرآن المجید ایسا کرنا ہم پسند نہیں کرتے۔

دُوم — علامتیں جو حروف مُفردہ تہجّی سے مقرّر کی گئی ہیں وہ اردو زبان کی تحریر میں حروفِ عبارت سے مشتبہ ہوجاتی ہیں، اور پڑھنے میں شبہ پڑتا ہے کہ وہ حرف بھی منجملہ حروف عبارت ہے، اس لیے ضروری ہے کہ علاماتِ مذکورہ صرف نقوش ہوں حروف نہ ہوں۔

سُوم — علاماتِ مذکورہ ایسی ہونی چاہئیں جو پتھر اور ٹائپ دونوں قسم کے چھاپے میں مستعمل ہوسکیں۔ پس اگر ہم ایسی علامتیں مقرر کریں جو ٹائپ میں بنی ہوئی مروج نہ ہوں تو بالفعل ہم کو نہایت مشکل پڑے گی، اور کسی طرح ہم کو نہ اُن علامتوں کا ہاتھ آنا میسر ہوگا، نہ ان کو بنا سکیں گے؛ اس لیے نہایت مناسب ہے کہ جو علامتیں انگریزی میں مروج ہیں وہی ہم اردو تحریر میں بھی اختیار کریں۔ ان علامتوں کا ٹائپ ہر قسم کا بنا ہوا دستیاب ہوتا ہے۔ پتھر کے چھاپے میں نہایت آسانی سے تحریر میں آسکتی ہیں، اور ان کی شکل ایسی ہے کہ کسی حرف کے ساتھ مشابہ نہیں ہے۔ صرف ایک علامت ہے جو حرف 'واؤ' کے مشابہ ہے؛ لیکن اُس کو الٹ دینے سے وہ التباس بالکل زائل ہوجاتا ہے۔

(اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ ص: ۶۶۴، علامات قرأت: ۱۱۔۱۲)

سرسید نے 'رسالہ نجوم العلامات' پر جو تنقید کی ہے، اس سے یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ مصنفِ رسالۂ مذکور نے قرآنی رموزِ اوقاف کی طرز پر اردو میں بھی رموزِ اوقاف وضع کیے تھے اور ان کے استعمال کا مشورہ دیا تھا۔ ظاہر ہے یہ اردو کے مزاج کے خلاف تھا، اسی لیے سرسید نے اس سے مدلل اختلاف کیا۔ سرسید آگے لکھتے ہیں:

''ہمارا ارادہ ہے کہ ہم 'تہذیب الاخلاق' میں ان علامتوں کا [کو] رواج دیں۔ اگر اور لوگ بھی اس کو پسند کریں گے تو امید ہے کہ اردو زبان میں بھی اس کا رواج ہوجاوے گا۔ اب ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ جناب منشی غلام محمد صاحب کے رسالہ کی خوشہ چینی سے ان علامتوں کا اس مقام پر کچھ بیان کریں۔ مفصلۂ ذیل علامتیں ہیں جو اردو

زبان کی تحریر میں مستعمل ہو سکتی ہیں:

، کاما، یعنی علامتِ سکتہ۔ انگریزی میں اس کی یہ شکل ہے [,] مگر یہ حرف، 'واؤ' کے مشابہ تھا، اس لیے اس کو الٹ دیا تا کہ حرفِ مفرد تہجی سے مشابہت نہ رہے۔

؛ سیمی کولن، یعنی علامتِ سکون۔ انگریزی میں اس کی صورت یوں [;] ہے۔ اس کو بھی الٹ دیا ہے۔

: کولن، یعنی علامتِ وقفہ۔ جہاں علامتِ سکتہ ہو اس لفظ پر پڑھنے میں ذرا ٹھہرنا چاہیے، اور جہاں علامتِ سکون ہو وہاں ذرا اس سے زیادہ، اور جہاں علامتِ وقفہ ہو وہاں ذرا اس سے بھی زیادہ۔

فل اسٹاپ، یعنی علامتِ وقفۂ کامل۔ یہ علامت اس بات کی ہے کہ یہاں فقرہ پورا ہو گیا۔

? نوٹ آف انٹروگیشن، یعنی علامتِ استفہام یا علامتِ سوال۔ [اسے بھی سرسید نے الٹ دیا]

! نوٹ آف ایکس کلیمیشن، یعنی علامتِ تعجب و حیرت و فرحت۔ اگر یہی نشان برابر دو [!!] کر دیے جاویں یا تین [!!!] کر دیے جاویں تو زیادہ تعجب و حیرت یا مسرت پر دلالت کرتے ہیں۔

- ہائی فن، یعنی علامتِ ترکیب

— ڈیش، یعنی خط یا لکیر

( ) پرن تھیس ال یعنی علامتِ جملۂ معترضہ

" " کوٹیشن، یعنی علامتِ اقتباس۔ انگریزی تحریر میں یہ علامت اس طرح پر لکھی جاتی ہے [,, "] مگر ہم نے دونوں کو اُلٹا رہنے دیا ہے۔

— لفظوں کے اوپر لکیر کر دینا۔ یہ قدیم علامت، نقل یا اقتباس کی ہے؛ جیسے کہ شرح میں متن کی عبارت پر لکیر کر دی جاتی ہے۔

— انڈر لائن، یعنی علامتِ توجہ۔ جن لفظوں کے نیچے لکیر کر دی جاتی ہے وہ اس بات کا نشان ہے کہ پڑھنے والا اس پر زیادہ توجہ کرے۔

* اسٹار یعنی نجم۔ کسی جملے یا عبارتِ منقولہ کے بیچ میں دو یا تین نجم لگا دینا اس بات کا نشان ہے کہ اس مقام پر سے کچھ لفظ یا عبارت جو مطلب سے متعلق نہ تھا یا اس کی نقل ضروری نہ تھی، چھوڑ دی گئی ہے اور ایک نجم، علامت حاشیے کی ہے۔

*†‡|| ان میں سے ہر ایک حاشیے کی علامت ہے۔

(اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ ص ۶۶۴، علامات قرأت: ۱۲-۱۴)

پہلا نشان بجائے نجم کے پھول ہے۔ جسے انگریزی میں Asterisk کہتے ہیں۔ دوسرا، اور تیسرا نشان بجائے جمع کے صلیب سے مشابہ ہے، جسے انگریزی میں Dagger (بمعنی خنجر) کہتے ہیں؛ اور چوتھا نشان دو لکیریں ہیں جسے انگریزی میں Pipe کہتے ہیں۔

سر سید نے مذکورہ بالا علامتوں کے استعمال کے طریقوں کی بھی وضاحت کی ہے۔ کاما [،] کی ۱۱ شقوں کے تحت، سیمی کولن کی ۳ شقوں کے تحت، کولن کی ۲ شقوں کے تحت، فل اسٹاپ کی ۳ شقوں کے تحت، باقی ساری علامتوں کو ایک ایک شق کے تحت مثال دے کر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

سر سید کی پیش کردہ مذکورہ بالا تجاویز کو اردو والوں نے کس حد تک قبول کیا، اور خود سر سید کی تحریروں میں ان کا کس حد تک استعمال کیا گیا، اس کا جائزہ لیے بغیر سر سید کے بعد توقیف نگاری کی صورت حال پر گفتگو بامعنی نہ ہوگی۔

راقم الحروف کے پیش نظر، 'اخبار سائنٹفک سوسائٹی' یعنی 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'[۱۲] اور 'تہذیب الاخلاق' کے متعدد شماروں کے عکس ہیں[۱۳]۔ ان میں سے ہر

ایک کی اشاعت کا دورانیہ مختلف ہے۔ سطورِ ذیل میں ان شماروں میں مستعمل رموز اوقاف کی نوعیت پر گفتگو کی جا رہی ہے۔

● **علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ**: ۲۵؍فروری ۱۸۷۶ء، ۱۳؍جنوری ۱۸۸۰ء، ۸؍دسمبر ۱۸۸۸ء، ۸؍ستمبر ۱۸۹۱ء

* قائم مقام فل اسٹاپ۔ پھول نما یہ فل اسٹاپ جملوں کے مکمل ہونے پر نہیں؛ بلکہ ہر پیراگراف کے خاتمے پر لگایا گیا ہے۔

– ڈیش، اس کا استعمال شاذ ہے۔

" " واوین کا استعمال بھی شاذ ہے۔

باقی اوقاف مجھے ان شماروں کے پیش نظر عکس میں نظر نہیں آئے؛ حالاں کہ انھیں شماروں کے انگریزی پر مشتمل حصوں میں ان کا پورا اہتمام ملتا ہے۔ پیش نظر شماروں کے عکس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اردو حصہ 'رموزِ اوقاف' سے قطعی بے نیاز ہے۔

● **تہذیب الاخلاق**، ۲۸؍مارچ، ۲۶؍اپریل، ۲۶؍مئی ۱۸۹۵ء

- ہائی فن۔ کاما کی جگہ ہائی فن کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔

— ڈیش۔ فل اسٹاپ کی جگہ طویل ڈیش کا استعمال کیا گیا ہے۔

* قائم مقام فل اسٹاپ۔ ہر پیراگراف کے خاتمے پر پھول کا استعمال بطور فل اسٹاپ کیا گیا ہے۔

؛ ، کاما اور سیمی کولن دونوں کا استعمال شاذ ہے۔

؟ ، ! کہیں کہیں فجائیہ اور سوالیہ کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔

: ، ( ) کولن اور قوسین کا استعمال بھی بہت زیادہ نہیں۔

" " واوین کا استعمال ملتا ہے، مگر الٹی طرز پر [" "]

- فل اسٹاپ ۔ پیش نظر شماروں میں فل اسٹاپ کا استعمال نظر سے نہیں گزرا۔ اس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ سرسید نے اسے نقطوں سے مشابہت رکھنے کے سبب اپنی تجاویز سے خارج کر کے ڈیش کو فل اسٹاپ کی جگہ قبول کرلیا تھا، جو بعد میں اردو میں رائج ہو کر آج تک مستعمل ہے۔

مختلف عہد کے آٹھ شماروں کے متفرق اوراق کے عکس یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ادارے کی طرف سے رموزِ اوقاف کے اہتمام کا دستور نہیں تھا۔ (آج بھی شائع ہونے والے رسائل کی یہی کیفیت ہے) اگر مضمون نگار نے اپنی تحریر میں ان کا استعمال کیا ہے تو یہ برقرار رکھے جاتے تھے۔ 'تہذیب الاخلاق' میں سرسید کے شائع شدہ مضامین میں کاما کی جگہ ہائی فن، فل اسٹاپ کی جگہ ڈیش اور پیراگراف کے خاتمے پر پھول کا بطور فل اسٹاپ استعمال کیا گیا ہے۔ کاما، سیمی کولن، کولن کا استعمال شاذ۔ سوالیہ اور فجائیہ، واوین اور قوسین کا استعمال بھی حسب ضرورت نہیں ہے۔

راقم الحروف کی ذاتی لائبریری میں عہدِ سرسید کی مطبوعہ بعض کتب موجود ہیں۔ صرف دو دہے (۱۸۸۱ء تا ۱۹۰۰ء) کی چھ کتابوں میں علاماتِ اوقاف کے استعمال کی کیفیت کو پیش کیا جارہا ہے، جس سے اس دور میں ان کے استعمال کی متعدد صورتوں اور حالتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۱- **آئینۂ تاریخ نما**، حصۂ اول، راجہ شیو پرشاد، ستارۂ ہند، مطبوعہ سرکاری چھاپہ خانہ، الٰہ آباد، ۱۸۸۱ء

+	کاما، یعنی کاما کی جگہ جمع کے نشان کا استعمال
❖	فل اسٹاپ، یعنی ڈیش کی جگہ چار نقطوں پر مشتمل پھول کا نشان
——	لفظوں کو نمایاں کرنے کے لیے لکیر
–	ڈیش ۔ صرف متعدد شہروں کے ناموں کے درمیان کاما کی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔

† صلیب نما نشان۔ ایک نمبر کے حاشیے کے لیے (Dagger)

‡ دو نمبر کے حاشیے کے لیے جمع کے دو نشان، نیچے اوپر (Double Dagger)

¶ تین نمبر کے حاشیے کے لیے دو متوازی کھڑی لائنیں اور ان کی بائیں جانب گول دائرہ (Pilcro)

( ) بریکٹ، یعنی علامتِ خطوطِ وحدانی، قوسین

— علامتی لکیر۔ ڈ، ڑ، ٹ کے تلفظ کے لیے د، ر، ت کے اوپر علامتی لکیر۔ مثلاً بیٹھ کر = بیٹھ کر۔ ڈولیوں = ڈولیوں وغیرہ

۲- **انٹرنس کورس فارسی، گلدستۂ دانش**۔ مولوی محمد محی الدین، مدرس اول گورنمنٹ ہائی اسکول الٰہ آباد۔ مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۸۸۳ء

❖ فل اسٹاپ، چار نقطوں پر مشتمل پھول

— ڈیش۔ کاما اور سیمی کولن کی جگہ ڈیش کا استعمال

؟ علامتِ استفہام

! علامتِ تعجب وندا

۱۲ حد۔ یہ ہندسہ حاشیوں کے آخر میں بالاہتمام لایا گیا ہے۔ حاشیے مارجن ہی میں دیے گئے ہیں۔

ـــ علامتِ حاشیہ۔ یہ علامت دے کر نمبر دیے گئے ہیں۔

علامتِ شعر وعلامت مصرعہ ندارد۔

۳- **توبتہ النصوح**، ڈپٹی محمد نذیر احمد، مطبوعہ مطبع نول کشور، کانپور، طبع پنجم، جون ۱۸۸۵ء

— ڈیش۔ کاما و سیمی کولن کی جگہ بھی ڈیش کا استعمال

❖ فل اسٹاپ، چار نقطوں کا یہ پھول فل اسٹاپ کے علاوہ دو مصرعوں کے بیچ میں اور دوسرے مصرعے کے آخر میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔

—	جملوں کو نمایاں کرنے کے لیے اوپر لائن کر دینا۔
~	شعرا کے تخلص کی علامت سے مشابہ یہ علامت مترادف جملوں، ایک ہی انداز کے لفظوں کو نمایاں کرنے کے لیے بہ افراط لگائی گئی ہے۔ یہ قدیم علامت ہے۔ عرشی صاحب نے 'مکاتیب غالب' کے مقدمہ میں املاے غالب کے سلسلے میں لکھا ہے کہ کبھی نئے جملے یا پیراگراف کے پہلے لفظ کے اوپر یہ علامت ~ بنا دیتے تھے جو عربی لفظ 'بتّ' بمعنی قطع کی ایک شکل ہے۔ (اردو املا، ۵۴۴)
( )	قوسین
سہ	علامتِ شعر، ع = علامت مصرع
~	علامتِ حواشی
۱۲	حاشیے کے اختتام پر۔ حد یعنی تمت کے معنی میں

۴- امیر اللغات ج/۱، منشی امیر احمد امیر مینائی، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۸۹۱ء

- قدیم علامتیں:

سہ	علامت شعر
سہ ~	علامت حاشیہ
~	علامت تخلص
عہ	علامت حاشیہ
—	خط بالائی

- جدید علامتیں:

؛	وقفہ
—	ڈیش
" "	واوین

( ) قوسین

{ منجھلا بریکٹ

? علامت استفہام

ان میں سے ڈیش اور منجھلے بریکٹ کو چھوڑ کر چار علامتوں کا دیباچہ میں ''دفعہ-۵- علاماتِ مقررہ'' کے تحت ذکر کیا گیا ہے۔ (ص ۵)

۵- **مہا بھارت مکمل** (بہ طرزِ ناول)، بابو سکھ دیال سنگھ شوقؔ، مطبوعہ مطبع مفید عام، آگرہ، بار سوم ۱۸۹۶ء

— کاما، سیمی کولن اور فل اسٹاپ تینوں کی جگہ ڈیش کا استعمال

!، !!، !!! علامتِ فجائیہ کا بہ کثرت استعمال

؟ علامتِ سوالیہ

ـــــ اشعار کے لیے

۱-۲ حواشی کے لیے پاورق میں بغیر کسی علامت کے نمبروں کا استعمال

۶- **یادگارِ غالب**، خواجہ الطاف حسین حالی، نامی پریس، کانپور، باراول ۱۸۹۷ء

، کاما، کا استعمال صرف مترادفات میں کیا ہے یا متعدد چیزوں کے تذکروں میں۔ اکثر کاما کی جگہ ڈیش کا استعمال کیا ہے۔

؛ سیمی کولن کا استعمال عمومیت سے کیا ہے۔

. فل اسٹاپ کا جملے کے اختتام پر استعمال کیا گیا ہے۔

'' '' واوین کو کتابوں کے نام اور اقتباس کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

— ڈیش کا استعمال اکثر کاما کی جگہ کیا گیا ہے۔

؟!( ) سوالیہ ندائیہ اور قوسین کا استعمال کم کم ہے۔

پھول [❖] اور صلیب [†] کا نشان حاشیے کے لیے؛ پھول کے نشان میں اس قدر ترمیم ہے کہ بجائے گول دائروں کے تین نقطوں کے نیچے ایک ہلکی سی لکیر کھینچ

دی گئی ہے جو صلیب کے نشان سے مشابہ ہے۔

اس زمانے کے ٹائپ میں یہ ساری علامتیں پائی جاتی تھیں، آج کمپیوٹر میں ان میں سے کئی ایک موجود نہیں، اس لیے ان کی صحیح شکل بتا پانا محال ہے۔سطورِ بالا میں پیش کردہ چھ کتابوں میں مستعمل علامتوں میں یکسانیت نہیں۔کوئی مصنف کسی علامت کو ترجیح دیتا ہے کوئی کسی کو۔جیسا کہ سطور گذشتہ میں بھی لکھا جا چکا ہے کہ عہد سر سید میں 'رموزِ اوقاف' کے استعمال کا رواج نہیں تھا، اوقاف اور علامات کے درمیان تقسیم بھی نہیں تھی، سارے نشانات کو علامات ہی کہا جاتا تھا۔سر سید نے بیش تر انگریزی اوقاف کو اردو میں رواج دینے کی تجویز پیش کی؛ لیکن چھ کتابوں میں مستعمل علامتوں کو دیکھ کر یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ اردو کے بڑے مصنّفین اور پبلشر اس سلسلے میں سنجیدہ نہیں تھے۔ بریکٹ، انورٹِڈ کاماز، سوالیہ، ندائیہ کے استعمال میں پانچوں کتابوں میں کوئی اختلاف نہیں؛ اختلاف ہے تو کاما، سیمی کولن، کولن اور فل اسٹاپ میں۔اُس دور میں فل اسٹاپ کی متعدد صورتیں رائج تھیں: علامتِ پھول [* ❖] Asterisk، علامت جمع [+] Plus، علامت صلیب [†] Dagger، علامت ڈیش [–]، علامت فل اسٹاپ [.] (بعد میں چھوٹے ڈیش یعنی ہائی فن [-] کو فل اسٹاپ کا قائم مقام مان لیا گیا اور بلا اختلاف اسی کا رواج پڑ گیا) کاما کی جگہ چھوٹے ڈیش [-] یا علامت جمع [+] کا استعمال تھا، سیمی کولن اور کولن کا رواج نہیں تھا۔ پانچوں کتابوں میں صرف 'یادگار غالب' واحد کتاب ہے جس میں بیش تر سر سید کی تجویز کردہ علامتوں کا استعمال کیا گیا ہے۔اس کی وجہ بظاہر یہ سمجھ میں آتی ہے کہ توقیف نگاری کی جانب حالی کو التفات تھا، اور نامی پریس کانپور کی بھی توجہ، املا اور اشاراتِ املا کی طرف خاصی تھی۔حالی وشبلی کی اکثر کتب اسی پریس سے شائع ہوئی ہیں۔

اس دور میں علامات وقف کے طور پر جن اشارات کا رواج تھا، وہ حسب ذیل تھے:

+ کاما کی جگہ جمع کے نشان کا استعمال، دیکھیے آئینہ تاریخ نما، راجہ شیو پرشاد، الہ آباد، ۱۸۸۱ء۔

+ فرہنگ آصفیہ میں ختمہ کی جگہ + کا نشان

❖ فل اسٹاپ کی جگہ چار نقطوں پر مشتمل پھول۔ سررشتہ تعلیم ہائے پنجاب کی طرف سے تدریسی کتب کے لیے منظور شدہ۔

— لفظوں کو نمایاں کرنے کی لکیر۔

† ایک نمبر حاشیے کے لیے صلیب کا نشان [Dagger]

‡ دو نمبر حاشیے کے لیے دو جمع کے نشان [Double Dagger]

¶ تین نمبر کے حاشیے کے لیے دو متوازی خط اور ان کی بائیں جانب گول دائرہ [Pilcrow]

– ڈرٹ کی ط کے لیے 'ت' پر علامتی لکیر [–] متّی = مٹی

❖ ڈرٹ کی ط کے لیے چار پھول نما نقطے ڈ ژ ٹ

| فل اسٹاپ کے لیے کھڑا خط

۱۲ کا ہندسہ فل اسٹاپ کے لیے

☆ کسی جملے یا عبارت میں، محذوف عبارت یا محذوف لفظوں کی نشاندہی کے لیے اس جگہ ایک، دو یا تین نجم بنادینا [☆، ☆☆، ☆☆☆]

بعض لوگ حاشیہ کی علامت کے لیے بھی ایک نجم استعمال کرتے تھے۔ اس دور میں فل اسٹاپ کے لیے متعدد صورتیں رائج تھیں۔

علامت پھول [❖] علامت جمع [+] علامت صلیب [†]

علامت ڈیش [–] علامت فل اسٹاپ [.]

○

رموزِ اوقاف کی تعیین اوران کو استعمال میں لانے کے سلسلے میں منشی غلام محمد اور سر سید احمد خاں کے بعد تیسری کوشش مولوی محمد نظام الدین حسن نوتنوی نے کی تھی۔

یہ اپنے دور کے روشن خیال عالم اور انگریزی زبان کے واقف کار تھے۔ پنکچوئیشن پر ۱۹۰۰ء میں ایک مختصر رسالہ بہ زبان انگریزی لکھا۔ اردو کی حسب ذیل کتب میرے علم میں ہیں:

(۱) اوقاف العبارت (لکھنؤ ۱۹۰۴ء)، (۲) الرموز (حیدرآباد ۱۹۰۴ء)، (۳) قرآن مجید مترجم بہ زبان اردو (لکھنؤ ۱۹۰۴ء)، (۵) تقسیم علمِ ادب (لکھنؤ ۱۹۰۴ء)، (٦) صحیفۂ تعیین زمان بذریعہ سالِ محمدی، (۷) صحیفۂ حرمتِ ربوٰ۔

یہ بھی انگریزی پنکچوئیشن کو فروغ دینے، ان کے نام طے کرنے اور انھیں اپنی تحریروں میں استعمال کرنے کے لیے جانے جاتے ہیں۔

انھوں نے اول انگریزی میں ایک مختصر سا رسالہ شائع کیا (۱۹۰۰ء) بعد میں اردو میں 'اوقاف العبارت' کے نام سے ۱۹۰۲ء میں ایک کتاب لکھی، جو ۱۹۰۴ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے بڑی تقطیع کے ٦۳ صفحات پر شائع ہوئی تھی۔

بنیادی طور پر اس کتاب کا موضوع ''اوقافِ قرآن کریم'' ہے؛ لیکن باب چہارم کے دو صفحات (٦۲-٦۳) میں ''رموزِ اوقافِ عبارت بہ طرز مغربین'' کے عنوان سے سات انگریزی علامات کو مع مجوزہ اردو نام متعارف کرایا گیا ہے۔ ان میں رابطہ یعنی کولن (:) کا مذکور نہیں۔ علامات حسب ذیل ہیں:

، وقف خفیف: اس میں مصنف نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ و (واؤ) لفظ وقف کا مخفف ہے؛ لیکن یہ علامت عربی و فارسی میں حرفِ عطف کے طور پر مستعمل ہے؛ لہٰذا مخففِ وقف (یعنی و) کو بہ شکل واؤ مقلوب استعمال کرتے ہیں۔

؛ نصف وقف

ـ وقف کامل: یہاں بھی مصنف نے علامت ''بتّ'' کا مخفف، ختمہ (یعنی موجودہ ڈیش) [-] قرار دیا ہے۔ علامت بت (‾) کثرتِ استعمال کے سبب سیدھے خط (—) کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ رشید حسن خاں نے بھی بعض مخطوطات میں بت کے مقام پر سیدھی لکیر کا ذکر کیا ہے۔ (اردو املا، ص:۵۴۴)

'' '' اقتباس (دو واؤ مقلوب جانبین): صہبائی اور سر سید نے بھی واوین اسی طرح درج کیے ہیں۔ یہ انگریزی قاعدے کے خلاف ہیں۔ یہ پتہ نہیں چل سکا کہ ایک ہی جانب ان کا رخ کر دینے میں مصلحت کیا ہے؟ اور اس طرح ان کو پہلے پہل کس نے استعمال کیا؟

(!) نُدبہ؍ا، ندا۔ مصنف نے ''قرآن مجید مترجم بہ زبان اردو'' میں اس کا ذکر کرتے ہوئے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ لفظ ندا کا خلاصہ الف اور نقطہ (!) ہے۔ (ص:۲۶)

؟ استفہام: یہ نشان انگریزی شکل کے مطابق ہے۔

() قوسین (یعنی خطوط وحدانی)

مولانا نوتنوی نے اس کتاب میں اِن علامات کا استعمال بھی کیا ہے۔ سیمی کولن یعنی وقفہ کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ علامت مساوی (=) بھی بعض جگہ نظر آتی ہے۔

مولانا نوتنوی نے اسی سال اپنے ترجمہ قرآن کریم باسم ''قرآن مجید مترجم بہ زبان اردو'' (مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۰۴ء) میں ''ضروری علامات'' عنوان کے تحت بھی ان اوقاف کا تعارف کرایا ہے۔ ان میں ایک علامت مقام ترک (۷) ہے۔ اس کی تشریح میں انھوں نے لکھا ہے:

''جن مقامات پر الفاظ متروک اضافہ ہوں، وہاں نشان کر دیا جاتا ہے، تاکہ محل ترکی معلوم ہو جاوے۔ =۷= یہ علامت سطر کے تحت میں لکھنا چاہیے؛ مثلاً: زید

ادائے صلوٰۃ کے بعد آیا'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر لفظ 'ادائے' متروک تھا۔
بالتفصیل دیکھو الرموز (ص:۲۶، مصنف کی دوسری کتاب، مطبوعہ حیدر آباد، ۱۹۰۴ء)

انھوں نے مذکورہ ترجمہ قرآن میں انگریزی اوقاف کا استعمال بھی کیا ہے جو اپنے آپ میں ایک اہم بات ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''علمائے مغربی نے جو علاماتِ عبارت مستعمل کیے ہیں، اور اس ترجمۂ قرآن مجید میں وہ بالاستیعاب درج کیے گئے ہیں؛ لہٰذا ان کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔ (ص:۲۶)

○

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نوتنوی کے پیش نظر صہبائی اور سرسید کی تحریریں نہیں رہیں۔

اردو کے وہ ممتاز قلم کار جو سرسید تحریک سے کسی نہ کسی درجے میں متاثر تھے، یا اُسی کے زائیدہ تھے، املا اور رموزِ اوقاف کی معیاری صورت کو طے کرنے کے حق میں تھے۔ اس سلسلے میں سید ممتاز علی (ف ۱۹۳۵ء)، مولانا شبلی نعمانی (ف ۱۹۱۴ء) اور ابوالکلام آزاد (ف ۱۹۵۸) کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔

سید ممتاز علی نے علاماتِ اوقاف کو رائج کرنے کی تجویز اپنے رسالے ماہنامہ کہکشاں لاہور میں پیش کی۔ انھوں نے اکتوبر ۱۹۱۸ء کے شمارے میں ''علامات قرأت'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، جس میں انھوں نے ان اوقاف کی اہمیت بیان کرنے کے بعد جملہ ادبی اور صحافی برادری کو غیرت دلائی کہ ایک طرف وہ حبّ الوطنی کا راگ الاپتے پھرتے ہیں، لیکن اتنی ہمت نہیں رکھتے کہ سہولتِ تفہیمِ مطالب کے لیے چار لکیریں علامات قرات کے لیے مقرر کر دیں اور قوم میں اس کا رواج جاری کر دیں۔''

مضمون کے آخر میں اپنے قارئین سے آرا طلب کرتے ہوئے لکھا: ''جب ہمارے پاس بہت سی علامتیں دوسروں کی تجویز کردہ پہنچ جائیں گی تو ہم ان سب کو کہکشاں میں درج کر کے ان کے انتخاب کی بابت ناظرین سے رائے لیں گے۔''

اسی شمارے کے اداریے بہ عنوان 'تقریب' میں بھی لکھا گیا کہ:

''اہل الرائے حضرات سے التماس ہے کہ اپنی اپنی آرا سے خاکسار کو مطلع فرمائیں۔ ان آرا کا خلاصہ کہکشاں میں درج کیا جائے گا۔ اور آخر ملک کے مقتدر حضرات نے مل کر جس قسم کی علامات کا فیصلہ کردیا، آیندہ انھیں علامات کو کہکشاں کی کتابت میں ملحوظ رکھا جائے گا۔''

کہکشاں کے قارئین نے اس پر کیا رائے دی یہ تلاش کرنے سے میں قاصر رہا کیونکہ بعد کے شمارے دستیاب نہیں ہو سکے۔

شبلی نعمانی کے ۴۹ خطوط بنام آزاد کے عکس دستیاب ہیں۔ (دیکھیے خطوط شبلی بنام آزاد، بقلم شبلی) اِن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ حالی کی طرح شبلی نے بھی اپنی تحریروں میں ان کا استعمال شروع کردیا تھا۔ وہ فُل اسٹاپ کی جگہ ڈیش لگاتے ہیں، کاما کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں، ندائیہ، فجائیہ، قوسین اور واوین کا بھی استعمال کرتے ہیں؛ لیکن کولن اور سیمی کولن کا بالکل استعمال نہیں کرتے۔ کہیں کہیں ناموں کو انڈرلائن بھی کرتے ہیں؛ لیکن اکثر عبارت کے خاتمے پر بجائے ڈیش کے کاما استعمال کرجاتے ہیں جو اضطراری عمل معلوم ہوتا ہے۔ ان کے برخلاف مولانا آزاد اِنھیں رموزِ اوقاف کا اِسی دور میں صحیح ترین استعمال کرتے ہیں۔ ماہنامہ لسان الصدق کلکتہ (اجرا: ۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۵ء) کی عکسی فائل پیش نظر ہے (مطبوعہ دہلی ۲۰۰۸ء) اس کی کتابت میں املا اگرچہ قدیم ہے (نون غنہ والے لفظوں میں نون کا اعلان کیا گیا ہے، مثلاً ہیں کو ہین، نہیں کو نہین، عیسائیوں کو عیسائیون وغیرہ) حروف کو ملا کر لکھنے اور علامتی رقوم یعنی ارقام سیاقی کے اندراج میں بھی انھیں تکلف نہیں؛ لیکن وہ رموزِ اوقاف: کاما، سیمی کولن، کولن، سوالیہ، فجائیہ، قوسین، واوین، انڈرلائن کا اہتمام کرتے ہیں جو اس دور کے دوسرے مصنفین اور اداروں کی مطبوعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک انفرادی کوشش اور بیش قیمت اہتمام معلوم ہوتا ہے۔ مولانا آزاد کی تحریروں سے یہ بھی طے پاجاتا ہے کہ سرسید کے تجویز کردہ فُل اسٹاپ [.] جو اردو میں نقطے سے

مشابہت رکھتا تھا کی جگہ ڈیش کا استعمال ۱۹۰۳ء میں ہی رواج میں آ گیا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ فل اسٹاپ [.] کی جگہ ڈیش [-] کا استعمال مولوی عبدالحق کا تجویز کردہ نہیں۔

مولانا آزاد نے 'پنکچویشن' کے عنوان سے ایک مضمون بھی لکھا تھا جو دو قسطوں میں ماہنامہ خدنگ نظر لکھنؤ، اکتوبر نومبر ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا تھا۔

اس مضمون کی قسط اول ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری (ف ۲۰۲۱ء) کی کتاب ''ارمغان آزاد'' (کراچی ۱۹۹۰ء) میں نظر سے گزری (ص: ۱۸۳ تا ۱۹۰) اس میں مولانا آزاد نے اول رموزِ اوقاف کی تعریف بیان کی، بعد ازاں ان اوقاف کا موجد تلاش کیا اور مشرقی زبانوں؛ عربی، سنسکرت، فارسی، ترکی، گجراتی اور اردو میں ان کے وجود و عدمِ وجود کا جائزہ لیا۔ انھیں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کی بعض مطبوعات میں ان کا استعمال نظر آتا ہے۔ بعض اردو کتب کے نام بھی انھوں نے درج کیے ہیں جن میں کم و بیش اوقاف استعمال کیے گئے ہیں۔

اس طویل تمہید کے بعد وہ ۱۳ علامتوں کا ایک چارٹ کی صورت میں حسب ذیل عنوانات کے تحت ذکر کرتے ہیں:

شمار/ علامت کا انگریزی نام/ علامت کی شکل/ ترجمہ/ مثال

ان میں وہ ساری علامات یا اوقاف مع اردو نام آ گئے ہیں جو سر سید کے مقالے میں جگہ پا چکے تھے۔ گویا یہ چارٹ سر سید کے مقالے کے عین مطابق ہے۔ صرف علامتِ حاشیہ میں تین علامتیں سر سید کے مقالے پر اضافہ ہیں۔

صاحب ارمغان آزاد کو اس مقالے کی دوسری قسط دستیاب نہیں ہوئی، جس میں مولانا آزاد نے ان کے محلّ استعمال پر بحث کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ ابوسلمان شاہجہانپوری نے لکھا ہے کہ ''شاید مولانا کو یہ مضمون لکھنے کا موقع نہیں ملا۔'' (ص: ۱۹۰)

اردو کے موقر ادیبوں و صحافیوں کی انفرادی کوشش اور رموزِ اوقاف کے ارتقائی

سفر کو رفتار دینے کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام اردو برادری، ان کے استعمال کی طرف مائل نہیں ہو سکی تھی۔ ۱۹۱۰ء کی مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند کی کتاب ''نپولینِ اعظم'' جلد چہارم (مترجم سید معین الدین شاہجہان پوری (ف ۱۹۳۷ء) پیش نظر ہے، اس میں رموزِ اوقاف کے استعمال کی وہ صورت نظر نہیں آتی جو مولانا آزاد کے یہاں دکھائی دیتی ہے۔ مولانا آزاد کم عمر ہیں، (لسان الصدق کی ادارت کے دوران) مغربی تعلیم یافتہ بھی نہیں، پھر بھی وہ رموزِ اوقاف کو ان کے صحیح محل پر استعمال میں لاتے ہیں؛ جب کہ سید معین الدین انگریزی کے استاد ہیں اور متعدد انگریزی کتب کے مترجم، وہ اس ترجمے میں کاما، ڈیش، واوین، قوسین، سوالیہ؛ شخصیات، شہروں اور ممالک کے ناموں پر لکیروں کا اہتمام کرتے ہیں؛ لیکن ڈیش اور کاما کے محل استعمال میں اکثر غلطی کرتے ہیں۔ کثرت سے کاما کی جگہ ڈیش کا استعمال کر جاتے ہیں۔ اس صورت حال سے یہ باور ہو جاتا ہے کہ انگریزی علامتوں کے استعمال پر اردو قلم کاروں اور اردو اداروں کے درمیان اتفاق رائے نہیں ہو سکا تھا۔

ایسا نہیں ہے کہ اوقاف کی اہمیت کا احساس قطعاً مفقود تھا۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی (ف ۱۹۸۰ء) نے اپنے ایک مضمون ''ہماری زبان اور ضرورتِ زمانہ'' (اردو اورنگ آباد اکتوبر ۱۹۲۲ء) میں اردو رسم الخط اور اوقاف کی تعیین کے لیے ایک کانفرنس بلانے کی تجویز پیش کی۔ اوقاف کے تعلق سے انھوں نے دو سوال اٹھائے:

(۱) اوقاف قرأت کے نہ ہونے سے اردو زبان کو نقصان پہنچتا ہے یا نہیں؟

(۲) اس کے لیے انگریزی اوقاف بجنسہ استعمال کیے جا سکتے ہیں یا ان میں کسی ترمیم کی ضرورت ہے؟

اسی طرح سہ ماہی اردو کے سلسلہ وار عنوان ''اصلاح رسم خط'' کے تحت پروفیسر محمد نعیم الرحمٰن الہ آبادی (ف ۲۷ رفروری ۱۹۵۰ء) نے اوقاف کے حوالے سے حسب ذیل تجاویز پیش کیں:

(۱) انگریزی کے تمام اوقاف استعمال ہوں۔

(۲) تمام اوقاف کی وہی شکلیں ہوں جو انگریزی میں ہیں: کاما، سیمی کولن اور سائن آف انٹروگیشن کی الٹی شکل استعمال کی جائے۔

(۳) اوقاف قرأت کی جگہ صرف 'اوقاف' کا استعمال کیا جائے۔

انھوں نے ۱۲؍اوقاف کے استعمال کی سفارش اور فارسی میں مستعمل ان کے ناموں کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنے مجوزہ نام بھی تحریر کیے۔ (اردو اپریل ۱۹۲۲ء)

محمد نعیم الرحمٰن فتح پور، نواب گنج، ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے تھے۔ گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس میں عربی کے پروفیسر رہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی سے بھی بحیثیت استاد وابستہ رہے۔ نصف درجن کتابیں ان سے بھی یادگار ہیں۔

(۱) خلافتِ موحدین (مدراس، ۱۹۲۲ء)، (۲) مسالک النظر (لکھنؤ ۱۹۲۶ء)، (۳) ناتن (الہ آباد ۱۹۳۰ء) (۴) اساسِ عربی (کراچی ۱۹۳۱ء)، (۵) چند دکنی پہیلیاں (الہ آباد ۱۹۳۶ء)

یہ ان ابتدائی لوگوں میں ہیں، جنھوں نے انگریزی پنکچوئیشن کو فروغ دینے میں تحریری اور عملی شکل میں حصہ لیا۔ انھوں نے دو مضامین لکھے:

(۱) اصلاح رسمِ خط، سہ ماہی اردو اورنگ آباد، اپریل ۱۹۲۲ء

(۲) اردو میں اوقافِ قرأت، تماہی ہندوستانی، الہ آباد، جولائی ۱۹۳۶ء

عملی طور پر انھوں نے ۱۹۲۱ء سے انگریزی پنکچوئیشن کا اردو میں استعمال شروع کر دیا تھا۔ ان کی پہلی کتاب 'خلافت موحدین' (۱۹۲۲ء) اس کا ثبوت ہے۔ بعد کی جملہ کتب و مقالات میں یہ علامتیں نظر آتی ہیں۔ اس کتاب میں سارے اوقاف استعمال کیے گئے ہیں سوائے کولن کے۔ کولن کی جگہ تفصیلیہ کا استعمال کیا گیا ہے اور ختمہ کے جگہ نقطے کا، جسے سرسید نے متعارف کرایا تھا۔ ہر پیراگراف کے آخر میں پھول اور عدد کے بعد ڈیش دیکھنے کو ملتا ہے۔ حیرت ہے کہ نعیم الرحمٰن' مولوی عبدالحق کے مضمون 'رموزِ اوقاف' مشمولہ قواعدِ اردو (۱۹۲۶ء) سے ناواقف رہے۔

اس دوران دارالترجمہ حیدرآباد (قیام: ۱۹۱۷ء تا ۱۹۵۱ء) میں املا خصوصاً اردو اعراب کے تعلق سے ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں حسب ذیل افراد شریک تھے:

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (پرنسپل عثمانیہ کالج)، مولوی عنایت اللہ (ناظم دارالترجمہ)، سید ہاشمی فرید آبادی (رکن دارالترجمہ)، مولوی وحید الدین سلیم (پروفیسر عثمانیہ کالج)، مولوی سید احمد علی (ناظم تعلیمات ضلع ناندیر)، مولوی سجاد مرزا (پرنسپل مدرسہ فرقانیہ عثمانیہ اورنگ آباد) اور بابائے اردو مولوی عبدالحق۔ اس مجلس میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے متعدد تجاویز پیش کیں، جنھیں منظور کرلیا گیا۔ علاوہ ان تجاویز کے ارکانِ مجلس نے با لاتفاق، اوقاف کے لیے حسبِ ذیل نو [۹] علامات اور اسما طے کیے۔[۱۴]

فل اسٹاپ کے لیے وقفہ [۔]، کولن کے لیے نیم وقفہ [:]، سیمی کولن کے لیے رابطہ [؛]، کاما کے لیے سکتہ [،]، اِن ورٹڈ کاماز کے لیے واوین [''']، نوٹ آف انٹروگیشن کے لیے سوالیہ [؟]، نوٹ آف انٹرجیکشن (ایکس کلی میشن) کے لیے ندائیہ [!]، بریکٹس کے لیے قوسین [( )]، ڈاٹس کے لیے نقطے [.....]

اس مجلس میں اوقاف کے بارے میں جو کچھ طے پایا اس کی اطلاع مولوی عبد الحق نے عبدالستار صدیقی کے مضمون ''اردو رسم خط میں اصلاح'' (مطبوعہ 'اردو' اورنگ آباد اکتوبر ۱۹۲۳) پر ادارتی نوٹ لکھتے ہوئے دی۔ بعد میں انھیں کو قدرے ترمیم کے ساتھ مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب ''قواعدِ اردو'' [باراول لکھنؤ ۱۹۱۴ء] کے طبع دوم ۱۹۲۶ء میں شامل کیا؛ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ عمومی طور پر یہ اوقاف اردو تحریروں کا حصہ نہیں بن سکے۔

ردو قبول کا یہ سلسلہ معمولی تصرف کے ساتھ آزادی تک اسی طرح جاری وساری رہا۔ اُس وقت تک 'علامات' اور 'رموزِ اوقاف' کے درمیان حد بندی نہیں تھی۔ کاتبوں کے لیے نستعلیق کتابت میں کاما، سیمی کولن اور کولن کا اہتمام کرنا مشکل عمل تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ عہد سرسید اور مابعدِ عہدِ سرسید اردو تدوین کے جتنے کام ہیں سب نسخ ٹائپ

میں کیے گئے؛ اور غالباً 'رموزِ اوقاف' کی معیاری درجہ بندی بھی انھیں مدوّنہ کتابوں کی رہینِ منت ہے۔ مولوی مہیش پرشاد (ف ۱۹۵۱ء)، مولانا امتیاز علی خاں عرشی (ف ۱۹۸۱ء)، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (ف ۱۹۷۲ء)، مالک رام (ف ۱۹۹۳ء) وغیرہ نے اپنی مدوّن تصانیف میں ان کے استعمال کی حقیقی اور معیاری صورت پیش کی۔ ۱۹۲۶ء میں مولوی عبدالحق نے قواعدِ اردو کے طبع دوم (انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۲۶ء) میں دو ابواب کا اضافہ کیا: رموز اوقاف اور عروض -- توقیف نگاری پر سرسید کی تحریر کے نصف صدی بعد پہلی بار انھوں نے ہی اس انتشار کو دور کرنے اور رموز اوقاف کے محل استعمال کو حتمی شکل دینے کی کوشش کی۔ انھوں نے سرسید کے تجویز کردہ ۱۳، اوقاف میں سے ۱۱ کا انتخاب کیا۔ بعد میں رشید حسن خاں (ف ۲۰۰۶ء) نے ۸، اور ڈاکٹر گیان چند (ف ۲۰۰۷ء) نے ۱۰، (صحیح ۸) اوقاف کو اردو مصنفین اور طلبہ کے لیے سہل الاستعمال بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس مضمون کے اختتام پر ایک نقشہ دیا جا رہا ہے جس سے یہ جان لینا آسان ہوگا کہ 'رموزِ اوقاف' کے سلسلے میں کب، کس نے کیا تجاویز پیش کیں؟ یہاں اس امر کا اظہار کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں مستعمل ان علامتوں کو 'رموزِ اوقاف' کا نام پہلی مرتبہ مولوی نظام الدین حسن نوتنوی نے اپنی کتاب اوقاف العبارت (لکھنؤ ۱۹۰۴ء) میں کیا۔ (ص ۳۶) اس سے پہلے یہ علامتیں، علاماتِ قرأت، اشاراتِ املا، نشاناتِ املا اور اوقافِ قرأت کہلاتی تھیں، اور اعراب، علامات اور رموزِ اوقاف کے درمیان کوئی حد بندی نہیں تھی۔ رشید حسن خاں پہلے مصنف ہیں، جنھوں نے اپنی کتاب 'اردو املا' (دہلی، بار اول ۱۹۷۴ء) میں ''اعراب۔ علامتیں۔ رموزِ اوقاف'' کے عنوان سے ایک مستقل باب قائم کیا، اور پہلی مرتبہ بتایا کہ املا، لفظوں کی صورت نویسی کا نام ہے، حرکات کا تعین اس میں شامل نہیں۔ (اردو املا، ص: ۵۱۶) معروف و مجہول آوازوں کے لیے جو نشانیاں استعمال کی جاتی ہیں؛ جیسے: مِیت، دوُر، یا بعض اور علامتیں؛ ان کو

رواج عام کے مطابق 'علامات' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ (اردو املا، ص: ۵۱۵)
رشید حسن خاں نے بڑی محنت سے ان علامتوں کی تقسیم کی ہے۔ ان کے بقول:

''علامتیں تین طرح کی ہوتی ہیں: ایک تو وہ جو کسی حرف کی نمائندگی کرتی ہیں، جیسے تشدید، کہ یہ ایک حرف کی نمائندگی کرتی ہے... دوسرے قسم کی علامتیں وہ ہیں جن کو اعراب کی ایک قسم کہا جا سکتا ہے، جیسے واوِ معروف پر الٹا پیش۔ اور تیسری قسم میں وہ علامتیں آتی ہیں، جن کی مدد سے بعض لفظوں کے خاص مفہوم کے تعین میں مدد ملتی ہے، یا وہ ایسے مخففات ہوتے ہیں جو کسی خاص مفہوم کی طرف ذہن کو منتقل کرتے ہیں... پہلی قسم کی علامتیں، حروف کا درجہ رکھتی ہیں؛ اس لیے یہ شاملِ املا ہیں۔ اس فہرست میں (۱) مد (۲) تشدید اور (۳) تنوین کے اعراب آتے ہیں...اب رہیں دوسری قسم کی علامتیں، تو جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، یہ نفسِ املا میں شامل نہیں۔ (اس میں یائے معروف و مجہول واو معروف و مجہول و ماقبلِ مفتوح و معدولہ، اور نون غنہ وغیرہ آتے ہیں)...تیسری قسم کی علامتیں وہ ہیں جن کی مدد سے لفظوں کے ایک خاص مفہوم کے تعین میں مدد ملتی ہے۔''

(اردو املا، ص: ۵۱۹ تا ۵۳۶)

تیسری قسم کی علامتوں کے تعلق سے رشید حسن خاں نے ایسی ۱۷ مروج علامتوں اور ۷ متروک علامتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ انھیں میں سے بعض علامتیں اوقاف میں بھی استعمال ہوتی رہی ہیں؛ لیکن اب اردو میں مروّج اوقاف کی تعداد صرف آٹھ رہ گئی ہے اور یہی معتبر ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل اس امر کی غماز ہے کہ توقیف نگاری نے بھی تاریخِ زبان و ادب کی طرح ایک لمبا سفر طے کیا ہے؛ اور اس سفر میں ڈاکٹر گل کرسٹ، سرسید، عبد الحق، رشید حسن خاں اور ڈاکٹر گیان چند نے اِن پر غور و فکر کر کے ان کے اردو نام اور ان کے استعمال کی صورتیں طے کر دی ہیں۔

ڈاکٹر گل کرسٹ نے آج رائج آٹھ رموزِ اوقاف میں سے تین [؟، !، ( )] کا تعین کیا۔ سرسید کی پیش کردہ ۱۳ علامتوں میں اور عبدالحق کی نقل کردہ ۱۱ علامتوں میں درج یہ آٹھوں علامتیں موجود ہیں۔ ہاں سرسید کی درج کردہ علامتِ فل اسٹاپ کو ڈیش [-] سے بدل دیا گیا ہے۔ انگریزی کی ان علامتوں کے اردو ناموں میں بھی اختلاف واقع ہو گیا ہے: مثلاً: سرسید، کولن کا ترجمہ وقفہ کرتے ہیں، عبدالحق نے سیمی کولن کو وقفہ کہا اور کولن کو رابطہ۔

گیان چند نے اپنی کتاب 'تحقیق کا فن' (لکھنؤ، بار اول ۱۹۹۰ء) میں رموزِ اوقاف کے اردو ناموں کے بجائے اصل انگریزی ناموں: فل اسٹاپ، کاما، کولن، سیمی کولن کا ذکر کیا ہے۔ (ص: ۲۸۶) گیان چند نے ۱۰، اوقاف دیے ہیں، لیکن دراصل یہ آٹھ ہی ہیں۔ انھوں نے قوسین کی گول اور چوکور ( )[ ] دونوں شکلوں کو انگریزی کے مطابق (اِسمال اور بِگ بریکٹ) ''چھوٹا بریکٹ'' اور'' بڑا بریکٹ یا مربع بریکٹ'' کی صورت میں علیحدہ علیحدہ اندراج کیا ہے، اور ان کے استعمال کی مثالیں دی ہیں۔ اسی طرح انھوں نے ''واوین'' کی بھی ایک قسم ''اکہرے واوین'' لکھی ہے اور اس کی مثالیں دی ہیں؛ اس طور ان کی تعداد، دس [۱۰] ہو جاتی ہے۔ گیان چند کو قوسین اور واوین کی ذیلی تقسیم کرنی چاہیے تھی؛ لیکن انھوں نے ان کو علاحدہ نمبر دے کر، دو علامات کا اضافہ کر دیا، جو درست نہیں۔

اس طور یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرسید کی اختیار کردہ ۱۳، علامتوں میں سے پہلے مرحلے میں ۱۱، بذریعۂ عبدالحق اور دوسرے مرحلے میں صرف ۸ علامتیں بذریعۂ رشید حسن خاں اور گیان چند ''رموزِ اوقاف'' کی صورت میں منتخب ہوئیں، اور یہ آٹھوں آج بھی رائج ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ''رموزِ اوقاف'' کی تعیین اور ان کے استعمال کو رواج دینے میں سرسید احمد خاں پہلے مردِ بزرگ ہیں، لیکن اس سلسلے میں ان کی خدمات کا صحیح ترین جائزہ ابھی نہیں لیا جا سکا ہے۔ راقم الحروف کی پیشِ نظر کوشش شاید

سر سید کے قدر دانوں کو اس سمت بھی متوجہ کر دے۔

رموزِ اوقاف سے متعلق گذشتہ صفحات میں پیش کردہ دستیاب حقائق کا تاریخی تناظر میں مطالعہ پیش کیا جا چکا ہے۔ ان حقائق کو اگر ادوار میں تقسیم کریں تو ان کی حسب ذیل صورت ہو گی:

پہلا دور: ۱۸۰۰ء-۱۸۷۴ء (تقریباً ۷۴ سال) ممتاز توقیف نگار: گل کرسٹ، صہبائی، منشی غلام محمد اور سر سید احمد خاں

دوسرا دور: ۱۸۷۵ء-۱۹۲۶ء (تقریباً ۵۲ سال) ممتاز توقیف نگار: مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد نظام الدین حسن نوتنوی، پروفیسر محمد نعیم الرحمن الہ آبادی اور مولوی عبدالحق

تیسرا دور: ۱۹۲۷ء-۱۹۷۳ء (تقریباً ۴۷ سال) ممتاز توقیف نگار: غلام رسول، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

چوتھا دور: ۱۹۷۴ء تا ایں دم (تقریباً ۵۰ سال) ممتاز توقیف نگار: رشید حسن خاں، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ڈاکٹر گیان چند، سفارشاتِ ترقی اردو بورڈ دہلی (۱۹۷۴ء) اور سفارشاتِ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد (۱۹۸۵ء)

پہلے دور کے سرخیل سر سید احمد خاں، دوسرے کے عبدالحق اور چوتھے کے رشید حسن خاں ٹھہرے۔ ان چاروں ادوار میں توقیف نگاروں کے لیے جو سفارشات وتجاویز پیش کی گئیں، استعمال کی جو صورتیں سامنے آئیں، جو اختلافات رونما ہوئے، جو جدا جدا نام تجویز کیے گئے؛ کوئی نوجوان محقق اٹھے اور اس پوری سرگزشت کا تفصیلی اور وضاحتی جائزہ پیش کرے۔ ''اردو املا کی تاریخ'' پر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے معارف (اعظم گڑھ، جون ۱۹۵۱ء) میں پہلا مقالہ لکھا تھا۔ آج تہتر سال کا عرصہ گزر چکا ہے، املا کی تاریخ پر کوئی دوسری روایت سامنے نہیں آئی۔

راقم الحروف نے رموزِ اوقاف کی تاریخ پر ۲۰۱۶ء میں قلم فرسائی کی تھی۔

(دیکھیے: تہذیب الاخلاق علی گڑھ سر سید نمبر، اکتوبر ۲۰۱۶ء) آج ۲۰۲۴ء میں یہ کتابی شکل اختیار کر چکی ہے؛ لیکن ابھی اس پہلو سے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو علمی مقالہ کا عنوان بنایا جائے۔

استدراک

راقم الحروف نے پیش نظر کتاب کی پی ڈی ایف کاپی لغت وفرہنگ کے ماہر اور محقق ڈاکٹر رؤف پاریکھ (کراچی) کو برائے ملاحظہ بھیجی تھی۔ انھوں نے میسج کے ذریعہ مطلع فرمایا کہ ماضی میں ہمارے یہاں سے بھی ایک کتاب اس موضوع پر شائع ہو چکی ہے۔ میرے لیے یہ نئی اطلاع تھی۔ میری طلب پر انھوں نے اس کتاب کے چند صفحات کے عکس فوری فراہم کر دیے۔ میں نے شکریے کے ساتھ ان کو میسج کیا کہ ''ہندو پاک کے مصنفین عام طور پر اس کتاب سے ناواقف ہیں۔ مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ) کے 'پاکستانی کلکشن' میں بھی یہ کتاب موجود نہیں۔'' انھوں نے جواب میں لکھا:

> ''ہائر ایجوکیشن کمیشن نے بعض کتب طالب علموں کی مدد کے خیال سے شائع کی ہیں، جو الحمدللہ ان کے گودام کے سوا کہیں نہیں ملتیں، کہیں بھی نہیں۔ اتفاقاً ان کے ہاں ایک کانفرنس میں جانا ہوا تھا تو ہاتھ لگی۔''

رموزِ اوقاف پر اردو میں پہلی کتاب ہونے کی وجہ سے میں نے اولین فرصت میں دستیاب عکسی صفحات کا مطالعہ کیا اور کتاب کا مختصر تعارف کرا دینا ضروری سمجھا۔

رموزِ اوقاف (تحریر کا حسن) از پروفیسر ڈاکٹر سید محمد عارف، ناشر ہائر ایجوکیشن کمیشن پاکستان، اسلام آباد، سال اشاعت ۲۰۰۷ء، تعداد صفحات ۱۶۸

مقدمہ اور حوالہ جات کے علاوہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے۔ مولف نے باب ہشتم کے تحت ۱۸/اوقاف اور تین علامتوں کی تشریح کی ہے، جو حسب ذیل ہیں:

ختمہ، سکتہ، وقفہ، رابطہ، تفصیلیہ، واوین (دوہرے)، واوین (اکہرے)، سوالیہ، استعجابیہ، قوسین (بڑے)، قوسین (درمیانے)، قوسین (چھوٹے)، خط، علامتِ حذف، ترچھا خط، خط زیریں، علامت تسویہ، علامتِ تجزیہ، مذکورہ اوقاف کے بعد علامتِ شعر ؎، علامت مصرع 'ع' اور علامت تخلص ؔ کا ذکر کیا گیا ہے۔

خاکسار کے پیشِ نظر مکمل کتاب نہیں ہے۔ محض چند منتشر صفحات کے مطالعے سے کتاب کی بابت حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی؛ تاہم فوری طور پر ذہن میں جو تاثر قائم ہوا اسے قلم بند کردینا ضروری سمجھتا ہوں۔

۱- مولف نے ۱۹۸۵ء-۱۹۸۶ء میں منعقدہ دو سمیناروں کی سفارشات اور روداد پر مشتمل اعجاز راہی کی مرتبہ دو کتابوں؛ ''املا و رموز اوقاف کے مسائل'' اور ''سفارشات املا و رموز اوقاف'' کو بنیادی ماخذ بنایا ہے۔ دونوں کتابوں کے مقالہ نگاروں کے یہاں جو اغلاط راہ پاگئی تھیں، مولف نے اپنے بیانات میں ان کو بھی سمیٹ لیا ہے۔

۲- مصنف نے توقیف نگاروں کی تحریروں کی بیشتر ثانوی اشاعتیں پیش نظر رکھی ہیں۔ اصل کتابیں یا ماخذ کم دیکھے ہیں۔

۳- تاریخی سیاق و سباق میں کس عہد میں کن کن اوقاف کا استعمال رہا، اس کی مثالیں نہیں دی گئیں۔

۴- گل کرسٹ، صہبائی، شبلی اور آزاد کا غالباً مطلق ذکر نہیں کیا گیا۔

۵- اوقاف کی تاریخ میں جو کچھ پچھلوں نے لکھا اسی کو من و عن پیش کردیا گیا۔

۶- غیر ضروری طور پر کتاب کو طول دینے کی کوشش کی ہے انگریزی نشانات اوقاف کی صورت گری کی عجیب و غریب توجیہات کی ہیں اور ان کو انسان کی جسمانی تصویروں سے نمایاں کیا ہے۔

۷- شیخ امام بخش صہبائی کا رسالہ قواعد اردو کا مقدمہ، منشی غلام محمد کا رسالہ نجوم العلامات،

مولوی نظام الدین حسن نوتنوی کا رسالہ اوقاف العبارت مولانا آزاد اور سید ممتاز علی کے مضامین وغیرہ کو مولف نے سرے سے نہیں دیکھا۔ ثانوی ماخذ سے جو کچھ ملا اسی پر اکتفا کر لیا۔

۸- علامتوں کو یکسر نظر انداز کر دیا، جبکہ ہندوپاک کے دو اداروں نے تقریباً ۱۷ علامتوں کو استعمال و رواج میں قائم رکھنے کی سفارش کی تھی اور یہ علامتیں دو چار کو مستثنیٰ کر کے آج بھی مستعمل ہیں۔

۹- طلبہ کے لیے رموزِ اوقاف کی اہمیت، افادیت اور استعمال کے طریقوں کے بیان کے لیے یہ کتاب بیش قیمت ہے، لیکن اوقاف کے ساتھ تحقیقی انصاف کرنے اور اس سے متعلق ابحاث و اشکالات کو جامعیت کے ساتھ پیش کرنے میں اس کا پایہ خاصا کمزور ہے۔

۱۰- انگریزی کی تمام علامتوں کو جو اردو میں مستعمل ہیں یا کبھی کبھی ہوتی ہیں انھوں نے اوقاف کے تحت شامل کیا ہے، جبکہ یہ توقیف نگار عبدالحق، رشید حسن خاں اور گیان چند کے پیش کردہ تصور کے خلاف ہے۔ کیا علامت مساوی (=) اور علامت تجزیہ (+) کو اردو رموزِ اوقاف میں شمار کیا جا سکتا ہے؟ انھوں نے واوین کی دو شکلوں اور قوسین کی تین شکلوں کو بھی علیحدہ علیحدہ اوقاف میں شمار کیا ہے، یہ بھی پچھلوں کے پیش کردہ تصور کے منافی ہے۔

دراصل مولف نے انگریزی اصولِ توقیف نگاری کا اطلاق اردو میں کرنے کی کوشش کی ہے، اردو میں ان کے عہد بہ عہد استعمال، اضافے اور متروکات کے عمل کو پیش نظر نہیں رکھا۔ ۱۹۹۴ء میں اردو میں رموزِ اوقاف کی تعداد آٹھ شمار اور اختیار کی گئی۔ اسی پر اردو برادری کا اتفاق بھی دیکھا گیا۔ اس آٹھ کی تعداد میں بھی سیمی کولن کو محض تکلفاً قبول کیا گیا تھا، لیکن موصوف نے یہ تعداد آٹھ سے بڑھا کر اٹھارہ کر دی۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیے

انگریزی نام	اردو نام	علامت	گل کرسٹ	صہبائی	سرسید
Comma ,	سکتہ	،	–	واو و	سکتہ ،
Semicolon ;	وقفہ	؛			سکون ؛
Colon :	رابطہ	:		زوج :	وقفہ :
Full stop .	ختمہ	.	ا	مد –	وقف کامل .
Note of Interrogation ?	سوالیہ	؟	؟	استفہامیہ ٩	استفہام ؟
Note of Exclamation !	فجائیہ/ندائیہ	!	!	فاصلہ !	تعجب !
Parentheses ()	قوسین	()	()	حشو ()	جملہ معترضہ
Inverted Commas " "	واوین	‘‘ ’’		واوِمعکوس ‘‘ ’’	اقتباس ‘‘ ’’
Dash -	خط	–			خط –
Hyphen -	علامت ترکیب	-			علامت ترکیب
Colon and dash :-	تفصیلیہ	:–			تفصیلیہ :–
Asterisk	علامت نجم	☆			نجم ☆
Ellipses ...	علامت نقاط	...			
Underline _	لکیر	—			انڈرلائن
Foot note	پاورقی حواشی				❖†‡¶☆
Brackets [ ]	قلابین	[ ]			

نظام الدین حسن نوتنوی	پروفیسر نعیم الرحمٰن	مولوی عبدالحق	رشید حسن خاں	گیان چند
وقف خفیف	قامہ ،	سکتہ	سکتہ	کاما ،
نصف وقف	مُفرزہ ؛	وقفہ	وقفہ	سیمی کولن ؛
	شارحہ :	رابطہ	رابطہ	کولن :
وقف کامل	نقطہ .	ختمہ	ختمہ	فل اسٹاپ ۔
استفہام	سوالیہ ؟	سوالیہ	سوالیہ	استفہام ؟
ندا	ندائیہ !	فجائیہ/ندائیہ	فجائیہ/ندائیہ	فجائیہ/ندائیہ !
قوسین	معترضہ ()	قوسین	قوسین	قوسین ( )
اقتباس	قامات معکوسہ ‘‘ ’’	واوین	واوین	واوین ‘‘ ’’
	ڈیش -	خط		
	رابطہ -	زنجیرہ y		
		تفصیلیہ		
	نقاط تقدیریہ...			
لکیر				
	تفریقیہ [ ]			

حواشی:

۱- یہ اصطلاح دو مستقل معنی رکھنے والے لفظوں سے مل کر بنی ہے. وقفہ۔جمع، اوقاف بمعنی ٹھہراؤ + رمز۔ جمع، رموز بمعنی علامت، نشان، اشارہ۔ مطلب یہ ہوا: ''ٹھہراؤ کے نشانات''۔'اردو لغت تاریخی اصول پر' کے مطابق مفہوم یہ ہے کہ''عبارت یا تحریر میں الفاظ اور فقروں کے درمیان وقفے؛ کم یا زیادہ دیر تک ٹھہرنے کے نشانات''۔اس اصطلاح کا واضع کون ہے؟ یہ ابھی تک پتہ نہیں چل سکا؛ البتہ اس کے اولین استعمال کی مثال مولانا محمد نظام الدین حسن نوتنوی کی کتاب''اوقاف العبارت'' (لکھنؤ ۱۹۰۴ء) کے باب چہارم کی سرخی میں ملتی ہے:''رموزِ اوقافِ عبارت بہ طرز مغربین'' اس سرخی میں انھوں نے اب تک کی معلومات کے مطابق''رموزِ اوقاف'' کی ترکیب پہلی بار استعمال کی تھی۔ پھر اسی سرخی کے تحت انھوں نے سات انگریزی پنکچوئیشن کے اردو نام تجویز کیے اور ان کی مختصر ترین تشریحات پیش کیں۔

اب سے پہلے خاکسار نے اس ترکیب کا واضع مولانا عبدالماجد دریابادی (ف ۱۹۷۷ء) کو قرار دیا تھا، اور اس کی سند اردو لغت تاریخی اصولوں پر ج/۱ سے فراہم کی تھی، جس میں لفظ''اوقاف'' کے تحت رموز اوقاف کے استعمال کی قدیم مثال مولانا دریابادی کی کتاب فلسفۂ اجتماع (لکھنؤ ۱۹۱۵ء) کے دیباچے سے دی تھی۔مثال یہ ہے.

اس کتاب میں دوسری غلطیوں کے علاوہ رموزِ اوقاف (Punctuation) کی غلطیاں بہت کثرت سے رہ گئی ہیں۔(دیباچہ، ص: د)

''اردو لغت تاریخی اصول پر'' ج ۱/ میں لفظ'اوقاف' کے معانی کے سلسلے میں مولانا ماجد کی یہ عبارت نقل کی گئی ہے، لیکن حوالے میں مصنف کے نام سے مطلع کیے بغیر کتاب کا نام' فلسفۂ احتجاج' درج کیا گیا ہے؛ اغلباً یہ کتابت کی غلطی ہے۔جب تک کوئی دوسری سند اس اصطلاح کے اولین استعمال کی نہیں مل جاتی اس کا واضع مولانا نوتنوی کو مانا جانا چاہیے۔ رموزِ اوقاف صحیح ترین ترجمہ ہے انگریزی لفظ Punctuation کا۔عام طور پر اس

اصطلاح کا واضع مولوی عبدالحق کو سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ درست نہیں۔

۲- میری طلب پر تیسری اشاعت کا عکس پروفیسر صغیر افراہیم (علی گڑھ) نے فراہم کیا، ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

۳- میری طلب پر پانچویں اشاعت کا عکس برادرم ڈاکٹر اطہر مسعود خاں (رامپور) نے عنایت کیا، بعض اور امور میں بھی معاون ہوئے، اس علم دوستی کے لیے ان کا ممنون ہوں۔

۴- مشتاق حسین کے بارے میں علی گڑھ کے بعض احباب سے رابطہ قائم کرنے کے باوجود مجھے بہت زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکی۔ وہ تین کتابوں کے مرتب ہیں:

۱- مکاتیب سرسید احمد خاں (حصہ اول و دوم)، سول لائن، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۶۰ء، تعداد صفحات: ۴۰۰

۲- علاماتِ قرأت، آزاد کتاب گھر دہلی، بار اول، ۱۹۶۲ء، تعداد صفحات ۲۴

۳- باقیاتِ شبلی، آزاد کتاب گھر دہلی، بار اول، ۱۹۶۴ء تعداد صفحات ۲۲۴

باقیاتِ شبلی، مجلس ترقی ادب لاہور، بار دوم، ۱۹۶۵ء

کتابوں پر ان کے نام کے ساتھ لکھا ہے: فاضلِ ادب (عربی) لکھنؤ یونیورسٹی، اسسٹنٹ لائبریرین (شعبۂ مشرقیات) مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ اپنی مرتبہ کتابوں پر لکھے دیباچوں سے وہ صاحب نظر ادیب معلوم ہوتے ہیں۔ غالباً ۱۹۶۹ء سے پیشتر کسی سال میں انھوں نے انتقال کیا۔

۵- گِل کرسٹ کا رسالہ باوجود تلاش بسیار دستیاب نہیں ہو سکا۔ رشید حسن خاں نے اس رسالے کے خلاصوں کی بنیاد پر ایک مضمون بہ عنوان ''گِل کرسٹ کا نظام املا'' 'باغ و بہار' کی تدوین کے دوران لکھا تھا، (مقدمہ باغ و بہار، حاشیہ ص: ۸۴) لیکن میں اسے تلاش کرنے سے قاصر رہا۔ جناب ٹی. آر. رینا (جموں) جو رشید حسن خاں پر اختصاصی مطالعہ رکھتے ہیں، وہ بھی اس مضمون سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔ جناب رینا نے مجھے رشید حسن خاں کی مدوّنہ 'باغ و بہار' کے مطلوبہ اوراق فراہم کیے، بعض عبارتوں کا ملان کرایا، ان

کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

۶- نستعلیق ٹائپ میں عموماً فورٹ ولیم کالج کی کتابیں چھپا کرتی تھیں، لیکن عام طور پر نسخ ٹائپ رائج تھا اور آج تک ہے۔ نستعلیق ٹائپ یکسانیت اور نفاست میں پورا نہ اتر پانے کے سبب مقبول نہیں ہو سکا، یہ غالباً اب دستیاب نہیں۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی مرحوم (علی گڑھ) کے ذاتی ذخیرے میں ایک کتاب باسم ''انتخابِ قصائدِ مرزا رفیع سودا'' مطبوعہ ۱۸۴۷ء نستعلیق ٹائپ میں موجود تھی۔ غالباً اب یہ ندوۃ العلماء کی شبلی لائبریری پہنچ چکی ہے۔

۷- نظامی بدایونی (ف ۱۹۴۷ء) نے 'دیوان غالب' کے دوسرے ایڈیشن (نظامی پریس بدایوں، ۱۹۱۸ء) کے دیباچے میں 'اشاراتِ املا' کی ترکیب استعمال کرتے ہوئے لکھا ہے: 'اشاراتِ املائی' میں بھی اس مرتبہ زیادہ صحت کا خیال رکھا گیا ہے، چوں کہ اُس وقت اشاراتِ املائی کی صورتیں مخصوص نہ تھیں اس لیے ہم نے انگریزی اشارات کا اتباع کیا ہے؛ البتہ اس قدر تصرف کیا ہے کہ کامے کی جگہ خفیف ڈیش سے کام لیا ہے۔' (ص:۶۲)

۸- یہ عکس جناب عبدالرشید (دہلی) نے اپنی ذاتی لائبریری سے عنایت کیے، بعض دوسرے امور میں بھی انھوں نے مشورے دیے، ان کی علم دوستی مثالی ہے اور شکریے کے رسمی لفظ سے بے نیاز ہے۔

۹- مرزا غالب کہیں کہیں ۵ کے ہندسے پر چھوٹی 'ط' بھی بنا دیتے تھے۔ عرشی صاحب کے الفاظ میں یہ لفظ 'فقط' کی طغرائی شکل ہے۔ (مکاتیب غالب:۲۳۳)

۱۰- اس مقالے کی پرانی اشاعتوں میں منشی غلام محمد کو شیخ غلام محمد، مدیرِ 'وکیل' (امرتسر) کے طور پر سمجھنے کا عندیہ ظاہر کیا تھا جو ظاہر ہے غلط ہے۔

۱۱- یعنی Parentheses or Brackets

۱۲- علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (اجرا: ۳۰ر مارچ ۱۸۶۶ء) بیک وقت انگریزی و اردو، دو زبانوں میں شائع ہوتا تھا؛ اس کے سرنامے پر مذکورہ دونوں نام درج ہوتے تھے، بعد میں

اردو نام (اخبار سائنٹفک سوسائٹی) کی جگہ صرف 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کو کافی سمجھا گیا۔

۱۳- 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کے متعدد شماروں کے عکس پروفیسر شافع قدوائی (علی گڑھ) اور عزیز مکرم فرقان سنبھلی مرحوم (علی گڑھ) نے اور 'تہذیب الاخلاق' کے عکس ڈاکٹر اطہر مسعود خاں (رامپور) نے ازراہِ عنایت بھیجے: کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا۔ بریلی میں قیام کے دوران انھوں نے مجھے لائبریری جانے کی زحمت سے راحت دی، میں اِن سب کا صمیم قلب سے شکر گزار ہوں۔

۱۴- نُدْبَہ !: لغوی معنی ماتم، کہرام، نوحہ، شیون۔ ان حروف کو بھی ندبہ کہتے ہیں، جو کسی کو یاد کر کے رونے، افسوس کرنے اور واویلا مچانے کے واسطے آتے ہیں؛ جیسے ہائے ہائے، وائے وائے وغیرہ۔

۱۵- علامت زنجیرہ کا یہ نشان انگریزی میں [V] سے مشابہ ہے جو Caret کہلاتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اسے V کا ہم شکل اور بہت چھوٹا دکھایا ہے، اور اس کو انگریزی نام ہائی فن دیا ہے۔

۱۶- سرسید نے 'نجم' سے علامتِ نقاط اور علامتِ حاشیہ دونوں مراد لیے ہیں۔ غالباً فُل اسٹاپ کے نقطے کی مشابہت سے بچنے کے لیے انھوں نے علامتِ نقاط کے لیے 'نجم' کا استعمال مناسب خیال کیا ہو۔ واللہ اعلم۔ انگریزی میں 'نجم' کو Star کہتے ہیں۔ اردو کمپوزنگ میں یہ آج بھی مستعمل ہے، لیکن اس کی حیثیت جداگانہ ہے۔

۱۷- سرسید نے عبارت کے اوپر کھینچی جانے والی لائن اور نیچے کھینچی جانے والی لائن دونوں کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیا ہے۔ اوپر کھینچے جانے والی لائن دراصل مشرقی علامت ہے۔ بہ قول سید ابوسلمان شاہجہاں پوری:

اس علامت کو علامت متن کہنا چاہیے، اس لیے کہ علامت نقل یا اقتباس، سرسید مرحوم نے خود آگے چل کر "اِن ورٹڈ کاماز" یا "واوین" کو قرار دیا ہے۔ اب یہ علامت اردو کتابوں

میں استعمال نہیں ہوتی؛ البتہ قدیم کتب تفسیر یا حدیث، فقہ کے شروع میں متن کی عبارت کو مفسر یا شارح کی عبارت سے ممیز کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

(قواعد صرف ونحوِ زبان اردو، حاشیہ نمبر۲ص:۱۰۳)

آج کمپیوٹر کمپوزنگ کے دور میں اس کا رواج ختم ہو چکا ہے۔

۱۸- انگریزی میں یہ علامات Asterisk, Dagger, Pipe or Pilcrow کہلاتی ہیں۔

رموزِ اوقاف، مفہوم، منشا اور تعبیر

وہ نشانات، اشارات یا علامات جن کے ذریعے لفظوں اور جملوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا جاتا ہے، انھیں رموزِ اوقاف کہتے ہیں۔

نثر و نظم میں رموزِ اوقاف کی کیا اہمیت ہے، اس کا اندازہ حسبِ ذیل جملوں سے لگایا جاسکتا ہے:

۱- روکو مت جانے دو۔	روکو؛ مت جانے دو۔	یعنی شخصِ مذکور کو جانے نہیں دینا ہے؛ بلکہ روکنا ہے۔ اس جملے کا ایک مفہوم یہ ہے۔
	روکو مت؛ جانے دو۔	یعنی شخصِ مذکور کو روکنا نہیں ہے؛ بلکہ جانے دینا ہے۔ یہ اس جملے کا دوسرا مفہوم ہے۔ دونوں مفہوم متضاد ہیں۔
۲- بیٹھو مت کھڑے ہو۔	بیٹھو؛ مت کھڑے ہو۔ بیٹھو مت؛ کھڑے ہو۔	ان دونوں جملوں کے بھی حسبِ سابق علیحدہ اور متضاد مفہوم ہیں۔

۳-لڑکے نے دوڑتے ہوئے گھوڑے کو دیکھا	لڑکے نے، دوڑتے ہوئے گھوڑے کو دیکھا	لڑکے نے دوڑتے ہوئے، گھوڑے کو دیکھا
۴-وہ آئے گا۔	وہ آئے گا؟ وہ آئے گا۔	یعنی وہ آئے گا کیا؟ خبریہ جملہ ہے۔ یہ جملہ کسی کے آنے کی محض اطلاع دے رہا ہے۔

مذکورہ بالا مثالوں سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ اوقاف کا استعمال کس قدر ضروری ہے۔ گفتگو میں تو ہم آواز کے زیر و بم، جسمانی اشاروں کنایوں سے اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کر دیتے ہیں؛ لیکن نثر میں گفتگو کے متغیر لہجے کی طرح منشائے مصنف کو سمجھ پانا قدرے مشکل ہے۔ اشعار کی تعقید تو اوقاف کے بغیر دور ہی نہیں کی جاسکتی۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری نے لکھا ہے:

''بات چیت اور عام گفتگو میں تو ہمیں ان اوقاف کے صحیح یا غلط استعمال کا پتہ بھی نہیں چلتا۔...... آواز کے زیر و بم، سختی یا نرمی، بلندی یا پستی، تیزی یا روانی، ٹھہراؤ اور لہجے کے خصائص سے ہم گفتگو کے ربط اور قاری کے مفہوم کو بہ خوبی سمجھ لیتے ہیں۔ قاری کا لہجہ اور گفتگو کا انداز ہمیں مفہوم کی گہرائی تک پہنچا دیتا ہے؛ لیکن اگر کوئی بات لکھی ہوئی اور املا کی شکل میں ہمارے سامنے آئے؛ چونکہ قاری کی آواز، اس کا اندازِ گفتگو اور لہجہ ہماری رہنمائی کے لیے موجود نہیں ہوتا، اس لیے تحریر و املا میں رموزِ اوقاف کے استعمال کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے؛ بلکہ صحیح تو یہ ہے کہ ضرورت وہیں ہوتی ہے۔''

(کتابیاتِ اردو املا اور دوسرے مسائل، ص:۱۵۹)

اسی لیے مشرق کی وہ زبانیں جو علمی، ادبی اور مذہبی ادب سے خاصی ثروت مند

ہیں، انھوں نے بیسویں صدی کے نصف اول میں انگریزی Punctuations کو قبول کرلیا تھا۔ انگریزی میں مروج اوقاف کی تعداد تقریباً ۲۶ ہے؛ لیکن عربی، فارسی اور اردو نے ان میں سے کم وبیش نصف کو جزوی تبدیلی اور تسمیہ کے ساتھ اپنے اپنے یہاں رواج دیا۔ آج یہی انگریزی اوقاف ان تینوں زبانوں میں مستعمل ہیں۔ عربی میں انھیں علامات الترقیم، فارسی میں نشان گذاری اور اردو میں ''رموزِ اوقاف'' کہتے ہیں۔

ہمارے بزرگ ان علامات کے لیے ایک عرصہ تک علاماتِ قرأت، اوقافِ عبارت، اشاراتِ املا، نشاناتِ املا، اور اوقاف القرأت جیسے نام استعمال کیا کرتے تھے۔ مولوی محمد نظام الدین حسن نوتنوی نے قرآن کریم کے نظامِ اوقاف پر مشتمل اپنی کتاب اوقاف العبارت (مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۰۴ء) کے باب چہارم کو ''رموزِ اوقافِ عبارت بہ طرز مغربین'' عنوان دیا تھا۔ اس عنوان میں ''رموزِ اوقاف'' کی ترکیب اب تک کی معلومات کے مطابق پہلی بار استعمال ہوئی، دوسری بار یہی ترکیب ۱۹۱۵ء میں مولانا عبدالماجد دریابادی (ف ۱۹۷۷ء) کی کتاب ''فلسفۂ اجتماع'' کے دیباچہ میں بھی استعمال کی گئی۔ ۱۹۲۶ء میں مولوی عبدالحق کی کتاب، قواعدِ اردو (طبع دوم) کے بابِ اوقاف کی یہی ترکیب سرخی بنی۔ تب سے آج تک اردو پنکچویئشن کے لیے یہی ترکیب مستعمل ہے۔

انگریزی پنکچویئشن کو اردو رسم الخط سے مربوط کرنے کے لیے ان کی شکل میں کچھ ظاہری تبدیلیاں کی گئیں:

, کاما جو واؤ سے مشابہ تھا، اُسے اُلٹ دیا گیا۔ اب اردو کا ماالٹے واؤ کی ہم شکل (،) قرار پایا۔

; سیمی کولن کو بھی مشابہتِ واؤ کے سبب اُلٹ دیا گیا۔ (؛)

? نوٹ آف انٹروگیشن کا رخ اردو جملے کے مطابق تبدیل کیا گیا۔ (؟)

یہ تینوں تبدیلیاں سر سید احمد خاں نے ۱۸۷۴ء میں کی تھیں، اردو برادری نے

انھیں قبول کرلیا اور یہ اسی طرح آج بھی مستعمل ہیں۔

. فل اسٹاپ: نقطے کی شکل میں تھا؛ سرسید اور بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اسی کو لگانا تجویز کیا۔ ان کی اتباع میں یادگارِ غالب از حالی (طبع اول ۱۸۹۷ء) اور مکاتیبِ غالب از مولانا عرشی (طبع اول ۱۹۳۷ء) میں ختمہ کے طور پر اسی نقطے کا استعمال کیا گیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اسے بھی ایک مختصر ڈیش (۔) کی شکل دی اور اسے ختمہ نام دیا۔ خاکسار کی نظر میں یہ وہی علامت ہے جو فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات میں گل کرسٹ کی تجویز پر بطور کاما مستعمل تھی جو انگریزی علامت ہائی فن سے مشابہ تھی یا جسے صہبائی نے 'مد' کا نام دیا تھا۔ اردو میں اسے ختمہ اور ڈیش دونوں کہا جانے لگا اور نقطے کے مقابلے اس کا استعمال رواج میں آگیا۔ غلام مصطفیٰ خاں، رشید حسن خاں، فرمان فتحپوری اور گیان چند نے بھی اس کی تائید کی۔ ترتیبِ اوقاف میں فرمان فتحپوری اور گیان چند نے ختمہ کو مقدم رکھا، اس سے پیشتر سرسید سے عبدالحق تک کاما کو مقدم رکھا گیا تھا۔

اس طور مروج آٹھ انگریزی اوقاف میں سے چار کو موزوں کرلیا گیا۔

" " صہبائی، سرسید، نوتنوی اور مولانا آزاد نے واوین کو دونوں سمت الٹا[‘‘ ’’] استعمال کرنے کی سفارش کی تھی۔ مولوی عبدالحق نے اسے انگریزی طرز کے مطابق کردیا۔(" ")

? صہبائی، نوتنوی اور مولانا آزاد سوالیہ کو انگریزی کے مطابق استعمال کرنے کی سفارش کرتے ہیں؛ لیکن سرسید نے اسے اُلٹ دیا اور مولوی صاحب نے بھی اسے برقرار رکھا۔(؟)

انگریزی اوقاف کے ناموں کے اردو متبادل تجویز کرنے اور انھیں قبول کرنے میں خاصا اختلاف رہا ہے، اسی طرح اِن کی حتمی تعداد بھی طے نہیں کی جا سکی

ہے؛ مختلف مصنفین نے مختلف نام اور تعداد کو پیش کیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بھی تذکرہ کر دیا جائے۔

- کاما (،) کو صہبائی ''واؤ''، سرسید ''سکتہ''، نوتنوی ''وقف خفیف''، نعیم الرحمٰن ''قامہ''[1]، عبدالحق، غلام مصطفیٰ خاں، رشید حسن خاں، فرمان فتحپوری و دیگر ''سکتہ'' اور گیان چند ''کاما'' لکھتے ہیں۔
- سیمی کولن (؛) کو سرسید اور آزاد ''سکون''، نوتنوی ''نصف وقف''، نعیم الرحمٰن ''مُفرِزہ''[3]، عبدالحق، غلام مصطفیٰ خاں، رشید حسن خاں، فرمان فتحپوری و دیگر ''وقفہ'' اور گیان چند سیمی کولن لکھتے ہیں۔
- کولن (:) کو صہبائی ''زوج''[4]، سرسید اور آزاد ''وقفہ''، نعیم الرحمٰن ''شارحہ''، عبدالحق، غلام مصطفیٰ خاں، رشید حسن خاں، فرمان فتحپوری و دیگر ''رابطہ'' اور گیان چند کولن لکھتے ہیں۔
- فل اسٹاف (.) کو صہبائی ''مد''[5]، سرسید اور نوتنوی ''وقف کامل''، نعیم الرحمٰن ''نقطہ'' عبدالحق، غلام مصطفیٰ خاں، رشید حسن خاں، فرمان فتحپوری و دیگر ''ختمہ'' (بصورت ڈیش [-]) اور گیان چند فل اسٹاپ لکھتے ہیں۔
- سائن آف انٹروگیشن (؟) کو صہبائی ''استفہامیہ''، سرسید، نوتنوی اور گیان چند ''استفہام''، نعیم الرحمٰن، عبدالحق، غلام مصطفیٰ خاں، رشید حسن خاں، فرمان فتحپوری و دیگر ''سوالیہ'' لکھتے ہیں۔
- نوٹ آف ایکس کلیمیشن (!) کو صہبائی ''فاصلہ''[6]، سرسید اور آزاد ''تعجب''، نوتنوی ''ندا''، نعیم الرحمٰن ''ندائیہ''، عبدالحق، غلام مصطفیٰ خاں، رشید حسن خاں، فرمان فتحپوری اور گیان چند ''فجائیہ[7] و ندائیہ'' لکھتے ہیں۔
- پرن تھیسس [()] صہبائی اِسے ''حشو''[8]، سرسید ''جملۂ معترضہ''[9]، نوتنوی ''قوسین''، نعیم الرحمٰن ''معترضہ''، عبدالحق، غلام مصطفیٰ خاں، رشید حسن خاں، فرمان

فتحپوری، گیان چند و دیگر ''قوسین'' لکھتے ہیں۔

- انورٹڈ کاماز ('' '') کو صہبائی اور نوتنوی ''دو واوَ معکوس جانبین''، سرسید ''اقتباس''، نعیم الرحمٰن ''قاماتِ معکوسہ''؎۱، عبدالحق، غلام مصطفیٰ خاں، رشید حسن خاں، فرمان فتحپوری، گیان چند اور دیگر ''واوین'' لکھتے ہیں۔

تعداد کے سلسلے میں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی (ف ۱۹۵۵ء) نے مولوی صاحب سے سخت اختلاف کرتے ہوئے صرف چار علامتوں کے استعمال پر اپنی رضامندی ظاہر کی تھی۔ یہ چار علامتیں وہ تھیں جو محکمۂ تعلیم پنجاب کی منظور شدہ تھیں اور انھیں محکمہ کی تحریک پر لکھی جانے والی کتاب ''رسالۂ قواعد اردو، (گورنمنٹ پریس، لاہور ۱۸۷۶ء) میں بطور ہدایت درج کیا گیا تھا اور یہی سرکاری نصاب کا حصہ تھیں۔ ان میں دو انگریزی اوقاف: سوالیہ (؟)، فجائیہ/ندائیہ (!) اور دو قدیم علامتیں: سکتہ کے لیے ایک چھوٹا خط (-) اور ختمہ کے لیے پھول (❖) کا نشان؎۱۔ اُن کے نزدیک سکتہ کے لیے ختمہ کی علامت (۔) اور ختمہ یعنی ڈیش کے لیے علامت جمع (+) کا نشان استعمال کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے مولوی عبدالحق کی پیش کردہ تمام علامتیں یک قلم خارج کر دیں سوائے واوین کے؛ واوین کو پسند کیا اور اقتباس اندر اقتباس ہونے کی صورت میں یہ تجویز پیش کی کہ ''اندرونی اقتباس کو اکہرے واوین میں لکھا جائے۔'' (' ') (ملاحظہ کریں کیفیہ، ص: ۳۴۷ تا ۳۵۱)

پنڈت جی کے بعد ڈاکٹر ابو محمد سحر (ف ۲۰۰۲ء) نے بھی پنڈت جی کے حوالے سے تعدادِ اوقاف کی تخفیف پر گفتگو کی ہے۔ وہ عبارت کو اوقاف سے گراں بار کرنے کے بالکل حق میں نہیں؛ لیکن ان میں سے بعض کے کارآمد اور مفید مطلب ہونے کا بھی اشارہ دیتے ہیں؛ لیکن کھل کر تعداد کا تعین نہیں کرتے۔ (دیکھیے: رموزِ اوقاف اور علامات، مشمولہ: اردو املا اور اس کی اصلاح، بھوپال، ۱۹۸۲ء)

رشید حسن خاں اور گیان چند نے بھی متعدد اوقاف کو غیر ضرور قرار دیا اور صرف

آٹھ اوقاف کے استعمال کی سفارش کی۔

راقم الحروف نے اس تاریخی اختلاف وتجاویز کو ایک چارٹ کی صورت میں محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے، جو پچھلے صفحات میں دیکھا جا سکتا ہے۔

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ گل کرسٹ نے (۱۸۰۱ء سے ۱۸۰۴ء کے درمیان) ۶، صہبائی نے ۱۸۴۵ء میں ۷، سر سید نے ۱۸۷۴ء میں ۱۴، ابوالکلام آزاد نے ۱۹۰۲ء میں ۱۱، نوتنوی نے ۱۹۰۴ء میں ۷، پروفیسر نعیم الرحمٰن نے ۱۹۲۳ء میں ۱۲، عبدالحق نے ۱۹۲۶ء میں ۱۱، غلام رسول نے ۱۹۶۰ء میں ۱۲، غلام مصطفیٰ خاں نے ۱۹۷۳ء میں ۱۱، رشید حسن خاں نے ۱۹۷۴ء میں ۸، فرمان فتحپوری نے ۱۹۷۷ء میں ۱۱، گیان چند نے ۱۹۹۰ء میں ۱۰ (صحیح ۸) اوقاف کا انتخاب اوران کی تشریح کی ہے۔

خاکسار نے اِنھیں آٹھ بنیادی اوقاف سے متعلق مذکورہ بالا مصنفین کی تشریحات کو ہر علامت کا علیحدہ عنوان قائم کرتے ہوئے زمانی ترتیب سے یکجا کر دیا ہے؛ تاکہ اس طور ہر علامت سے متعلق ۱۸۴۵ء سے ۱۹۹۴ء تک کے مختلف ومتعدد اقتباسات کے ذریعے اوقاف کی تفہیم وتشریح کا دورانیہ اور استعمال کرنے کی صورتیں اور تجاویز واضح ہو سکیں۔

اس سلسلے میں جن تحریروں سے اقتباسات جمع کیے گئے ہیں، وہ خاکسار کی نظر میں رموزِ اوقاف کی تعیین وتفہیم کی نمائندہ تحریریں ہیں۔ ان میں مولوی عبدالحق کی ''قواعدِ اردو'' کا بابِ 'رموزِ اوقاف' خاص اہمیت کا حامل ہے۔ جس کی بازگشت غلام مصطفیٰ خاں، رشید حسن خاں اور فرمان فتحپوری وغیرہ کے یہاں بھی سنائی دیتی ہے۔

بایں سبب اوقاف سے متعلق اِن کی تحریروں سے صرف ان بیانات کا انتخاب کیا گیا ہے، جو مولوی عبدالحق سے مستفاد ومستعار نہیں۔

یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ رشید حسن خاں نے اردو املا میں 'اعراب- علامتیں- اوقاف، کا جو عنوان قائم کیا ہے۔ اس میں رموزِ اوقاف سے متعلق مولوی عبدالحق کی تحریر شامل کی ہے۔ ان کے بقول:

''علاماتِ اوقاف کے بیان کو مولوی صاحب مرحوم نے نہایت خوبی اور مناسب تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، اور ہر علامت کے ذیل میں مثالیں بھی لکھی ہیں۔ میں ان مثالوں کو مختصر کر کے اس بیان کو وہیں سے نقل کرتا ہوں؛ کیونکہ اس سے زیادہ اختصار اور خوبی کے ساتھ اور کیا لکھا جائے گا۔ کم سے کم میں نہیں لکھ سکتا۔'' (اردو املا ص ۵۴۸)

رشید حسن خاں نے تین علامتوں: زنجیرہ، تفصیلیہ، خط نیز وقفہ (:) کے بیان میں سے شق نمبر ۳ / اور ۴ کو شامل نہیں کیا ہے۔

رابطہ (ص ۵۵۴) فجائیہ (ص ۵۵۶) واوین (ص ۵۵۶) سوالیہ (ص ۵۵۷) کے بیان میں اپنے اضافوں کو قلابین [ ] میں پیش کیا ہے۔ یہ اضافے بڑے قیمتی ہیں۔ بعد میں انھوں نے اپنی کتاب ''عبارت کیسے لکھیں'' (بار اول ۱۹۹۴ء) میں رموز اوقاف پر مستقل ایک تحریر شامل کی جس میں یہ اضافے بھی سمو دیے گئے۔ پیش نظر کتاب میں بیشتر اوقاف سے متعلق اقتباسات اسی کتاب سے اخذ کیے گئے ہیں۔

رسائل میں چھپنے والے دو ایک مضامین سے بھی قابلِ ذکر اقتباس شامل کر لیے گئے ہیں؛ البتہ وہ علامتیں جن کا بدل مستعمل علامتوں میں تلاش کر لیا گیا (جیسے تفصیلیہ کا کولن سے) یا اردو میں اُن کا استعمال شاذ ہے یا جنھیں ہمارے چند بزرگ ادیبوں نے متروک کے زمرے میں رکھا ہے؛ ان میں قابلِ ذکر یہ تین علامتیں ہیں:

خط یعنی Dash (—)

تفصیلیہ Colon & Dash (:-)

زنجیرہ Hyphen(v)

رشید حسن خاں نے ''اردو املا'' میں ان تین علامتوں کو متداول فہرستِ اوقاف سے خارج کر دیا ہے اور ان کو خارج کرنے کی معقول وجوہ بیان کی ہیں، جنھیں اس کتاب کے آخر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

باقی چند دوسری علامتیں مثلاً 'لکیر'، نقطے وغیرہ کو علامات ومخففات والے حصے

میں شامل کیا گیا ہے۔ ان مروج آٹھ بنیادی علامتوں: ختمہ، سکتہ، وقفہ، رابطہ، سوالیہ، فجائیہ ندائیہ، قوسین اور واوین کے علاوہ بھی بعض علامتیں اور اضافی اوقاف، لغات اور انسائیکلوپیڈیا وغیرہ میں مستعمل ہوتے رہے ہیں، کتاب کے آخر میں ان کا بھی اشاریہ دے دیا گیا ہے۔ رموزِ اوقاف کی اس پیش کش میں زمانی ترتیب کا بطورِ خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔

یہاں یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام (۱۸۰۰ء) کے بعد ہی سے رموزِ اوقاف کے استعمال کی تحریک و تجویز شروع ہوگئی تھی۔ سوا سو سال کا سفرِ قبولیت و عدم قبولیت طے کرنے کے بعد ۱۹۲۶ء میں اِنھیں ایک طرح سے حتمی شکل دے دی گئی۔ ان کے اردو نام، استعمال کے طریقے، اردو گرامر کا لحاظ رکھتے ہوئے مدوّن اور روقفِ عام کر دیے گئے۔ ساتھ ہی انجمن ترقی اردو کی جانب سے نصابِ تعلیم کی ترتیب و اشاعت کے متعدد سلسلے شروع کیے گئے اور اِن تدریسی کتب کے ذریعے ملک کے قرب و جوار میں ان کے استعمال کی راہ ہموار کی گئی۔ انجمن کی علمی و ادبی مطبوعات میں بھی ان کو استعمال کرنے کی کوششیں جاری رہیں۔ اس طور دھیرے دھیرے یہ ادب، صحافت، مذہب اور اس سے متعلق کتب میں بار پانے لگے؛ لیکن ان کو تحریر میں رواج دینے کے لیے جس اہتمام کی ضرورت تھی وہ اہتمام ملکی سطح پر نہیں کیا جا سکا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے استعمال کا عمل پھر سے انتشار کا شکار ہوگیا۔ مجموعی یا ملکی سطح پر ان کے استعمال کے طریقے کوئی یکساں اور معیاری صورت پیش نہیں کر سکے۔ ان کے استعمال پر مصنفین کی اپنی مرضی، پسند و ناپسند، قبول و عدم قبول کی صورت میں حاوی رہی۔

۱۹۸۱ء میں پروفیسر محمد سلیم (ف ۲۰۰۰ء) نے اپنی کتاب ''اردو رسم الخط'' (کراچی ۱۹۸۱ء) میں اِن کے اردو ناموں پر سوالات قائم کر دیے۔ انھوں نے 'کاما' کے لیے اردو نام ''اُلٹا پیش''، ختمہ یعنی ڈیش کے لیے ''خط''، کولن کے لیے ''نقطتین''

تجویز کیے۔ مربع بریکٹ کے لیے قلابین تجویز کیا۔ پہلے تین نام اردو دنیا نے رد کردیے آخری نام کو قبول کرلیا۔

رشید حسن خاں اور بعض دوسرے لوگوں نے چار علامتوں: خط یعنی ڈیش (—)، تفصیلیہ (:-)، زنجیرہ (v) اور رابطہ (؛) کو متروک قرار دیا، یا اختیاری کا درجہ دیا۔ انھیں آئے دن کے اختلافات کے پیش نظر ہندوپاک کے ادبی اداروں نے معیاری املا اور رموزِ اوقاف کی حتمی تعیین کے لیے 'املا کمیٹی' قائم کرنے کی اپیل کی، جس کے تحت ادب کے چند دانش ور بیٹھ کر غور وخوض کریں اور ایک قابلِ قبول، سہل العمل اور حتمی صورت، املا اور رموزِ اوقاف کی طے کرنے میں پیش قدمی کریں۔

چنانچہ ۱۹۷۴ء میں ترقی اردو بورڈ دہلی (حال قومی کونسل برائے فروغ اردو) نے تین افراد پر مشتمل ایک املا کمیٹی تشکیل دی، جس کے صدر ڈاکٹر سید عابد حسین (ف ۱۹۷۸ء) اور رکن رشید حسن خاں (ف ۲۰۰۶ء) و گوپی چند نارنگ (ف ۲۰۲۲ء) تھے۔

ان تین افراد نے املا اور رموزِ اوقاف سے متعلق جو سفارشات پیش کیں وہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی ترتیب سے بہ عنوان ''املا نامہ'' اسی سال مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی سے شائع ہوئیں۔ اس میں دس علامتوں: سکتہ، وقفہ، رابطہ، ختمہ، سوالیہ، فجائیہ ندائیہ، بریکٹ، خط، واوین، خط زریں کے استعمال کی سفارش کی گئی ہے۔ (املا نامہ، ص: ۷۹) ان میں دو علامتیں خط یعنی Dash، خط زریں یعنی انڈرلائن ہماری انتخاب کردہ تعداد پر اضافہ ہیں۔

پاکستان میں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے ''املا اور رموز اوقاف کے مسائل'' عنوان سے دو سال ۱۹۸۵ء-۱۹۸۶ء سہ روزہ دو بڑے سمینار منعقد کیے۔ ۲۵ تا ۲۷ رجون ۱۹۸۵ء کو منعقدہ اجلاس کی پانچویں نشست میں املا اور رموزِ اوقاف کے ضمن میں مقالہ نگاروں نے کچھ سفارشات پیش کیں۔ ان سفارشات کا جائزہ لینے

کے لیے ایک ذیلی کمیٹی تشکیل دی گئی، جس کے صدر ڈاکٹر فرمان فتحپوری، معتمد ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی اور اراکین: مظفر علی سید، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، پروفیسر شریف کنجاہی، ڈاکٹر ممتاز منگلوری اور اعجاز راہی تھے۔

اس کمیٹی کے دو اجلاس ۲۸ر جون ۱۹۸۵ء اور ۲۲ر اکتوبر ۱۹۸۵ء کو منعقد ہوئے۔ کمیٹی کا حتمی اجلاس ۱۶ر فروری ۱۹۸۶ء کو ہوا جو تین دن جاری رہا۔ اس میں بہ قول اعجاز راہی:

املا، رموزِ اوقاف اور اعداد کے تمام اختلافی پہلوؤں، تضادات اور عمومی مسائل پر بالتفصیل غور کیا گیا اور سفارشات کو حتمی شکل دی گئی۔

(سفارشات املا و رموزِ اوقاف، ص ۸)

یہ ''سفارشات'' ''سمینار کی روداد'' اور اس میں پڑھے جانے والے ''منتخب مقالات'' کتابی شکل میں علیحدہ علیحدہ شائع ہوئے۔ رموزِ اوقاف کے سلسلے میں اس کمیٹی نے ختمہ، سکتہ، رابطہ، سوالیہ، فجائیہ ندائیہ، قوسین، واوین، ترچھا خط، محذوفہ (یعنی علامت ترک ۸)؛ کل ۹ علامتوں کو استعمال کرنے کی سفارش کی۔ چار علامتوں کے استعمال کو اختیاری کے زمرے میں رکھا: وقفہ، تفصیلیہ، نقطے اور زنجیرہ۔

(سفارشاتِ املا و رموزِ اوقاف، ص: ۳۷، ۳۸)

لیکن اسے اردو والوں کی سادگی ہی کہیں گے کہ یہ سفارشات بھی مجنوں کا قول ثابت ہوئیں۔ تحریر و کتابت کا قافلہ جس طرح رواں تھا، وہ ابھی تک اسی طرح رواں دواں ہے، اس میں کوئی عمومی فرق اور بہتری نہیں آسکی ہے۔

ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہند و پاک کے محققین نے اپنی متفرق تصانیف خصوصاً متون کی تدوین میں ان کے استعمال کی ایک معیاری صورت پیش کی ہے۔ ان کے علاوہ پاکستان میں مقتدرہ قومی زبان، مجلس ترقی ادب لاہور کی مطبوعات اور خاص کر ترقی اردو بورڈ کے زیرِ نگرانی مرتبہ ''اردو لغت تاریخی اصول پر'' کی ۲۲ جلدوں

(مطبوعہ ۱۹۷۷ء تا ۲۰۱۰ء) میں بھی ان کے استعمال کا خاص سلیقہ نظر آتا ہے۔

ادارۂ فروغِ قومی زبان (قدیم نام، مقتدرہ قومی زبان) اسلام آباد نے ۲۰۲۲ء میں دو روزہ قومی سمینار بہ عنوان ''اردو املا کی معیار بندی مسائل اور حل'' منعقد کیا، جس کی ''قومی مجلس برائے سفارشاتِ اردو املا'' کی منظور کردہ سفارشات باسم ''سفارشاتِ اردو املا ۲۰۲۲ء'' اسی سال اسی ادارے سے چھپ کر شائع ہوئی۔ ان سفارشات میں رموزِ اوقاف کو شامل نہیں کیا گیا۔ اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں رموزِ اوقاف کے استعمال کی صورت حال خاصی بہتر ہے۔

میر کے الفاظ میں:

پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

کے مصداق خاکسار کی خواہش ہے کہ ہر اردو خواندہ اور اردو نویس، تحریر و کتابت کی مشق کے ساتھ ہی رموزِ اوقاف کے استعمال کا طریقہ اور صورتیں سیکھے اور اپنی تحریر و عبارت کے حسن کو دوبالا کرے۔

زیرِ نظر کوشش اسی خواہش کی تکمیل ہے۔ رہے نام اللہ کا!

○

رموزِ اوقاف-تعریف اور اہمیت

صہبائی (زمانۂ اشاعت ۱۸۴۵ء)

معلوم کیا چاہیے کہ عبارت پڑھنے میں بعضے مقام پر اس طرح سے آواز متغیر ہو جاتی ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاں مقام توقف کا ہے اور مراتب، توقف کی بھی متفاوت ہوتی ہیں؛ بعضے جگہ کم اور بعضے جگہ زیادہ؛ مثلاً:

میں نے سنا تھا کہ کل آپ میرے گھر تشریف لائے تھے؛ از بسکہ مجھ سے ملاقات نہ ہوئی، بے تامل چلے گئے؛ آج تشریف لانے میں کمالِ بندہ نوازی ہے۔

''سنا تھا'' پر کچھ توقف کیا گیا ہے اور ''لائے تھے'' پر اس سے زیادہ اور اسی طرح ''نہ ہوئی'' پر بھی گونہ وقف ہوا ہے؛ اور ''چلے گئے'' پر اس سے زیادہ۔ اور بعضے مقام میں زمانہ کو کچھ دخل نہیں؛ بلکہ تغیرِ آواز اس واسطے ہوتی ہے کہ اس سے امتیاز مضمون کی ہو جاوے؛ مثلاً یہ عبارت ''وہ آوے گا'' محتمل دو وجہ کو ہے: اخبار یا استفہام؛ بوقتِ اخبار کے تغیر، آواز کی اور طرح ہے اور بوقت استفہام کے اور طرح؛ چنانچہ روزمرہ دان پر یہ بات ظاہر ہے؛ پس بعضے عقلا نے یہ چاہا کہ بعضی علامتیں ایسی مقرر کرنا چاہئیں کہ لکھی ہوئی عبارت میں سے بھی امتیاز ان امور کی ہو سکے۔

(رسالۂ صرف ونحوِ قواعدِ اردو، ص: ۷-۸)

منشی غلام محمد (سالِ اشاعت ۱۸۷۲ء)

سب سے پہلے علامات [مراد رموزِ اوقاف] کی احتیاج کا بیان کرنا ضروری ہے۔علامات کا کام یہ ہے کہ لکھی ہوئی عبارت میں ہر طرح کے وقفے بیان کریں، جس طرح کہ کوئی فصیح بولنے والا گفتگو کرتا ہے۔ ضرورت علامتوں کی ہر ایک زبان میں بدرجۂ اتم ہے؛ کیونکہ بغیر علامتوں کے جملوں کی تفریق کرنا، ان کے اقسام دریافت کرنا، صحیح معنیٰ کا سمجھنا اور عبارت جیسی چاہیے ویسی پڑھنا مشکل ہوتا ہے۔جن زبانوں میں علامتیں مروّج ہیں ان میں کم خواندے بھی عبارت بآسانی تمام درست پڑھ سکتے ہیں اور خود علامتیں جملوں کے اقسام اور مقامات وطریقِ توقف بتاتی ہیں؛ اس لیے عبارت کے صحیح معنیٰ بھی فوراً ذہن نشین ہوتے ہیں۔

(رسالہ نجوم العلامات ص: ۱۵، ۱۶)

سرسید (زمانۂ اشاعت ۱۸۷۴ء)

اس مقام پر لفظِ 'قرأت' سے ہماری مراد ''قرأتِ مصطلحۂ قرآن مجید'' نہیں ہے؛ بلکہ اس کے لغوی معنیٰ مراد ہیں؛ یعنی پڑھنے کے نشان۔ انگریزی میں چند علامتیں مقرر ہیں جن کو 'پنکچویشن' کہتے ہیں۔ انگریزی عبارت میں وہ نشان ہمیشہ لگائے جاتے ہیں؛ ان سے فائدہ یہ ہے کہ عبارت کو فصیح طور پر پڑھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

ان نشانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جملہ کہاں ختم ہوا، کہاں سے دوسرا مطلب شروع ہوا؛ کون سے لفظ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں، کون سے علاحدہ ہیں؛ عبارت پڑھنے میں کس جگہ ٹھہرنا چاہیے، کس جگہ ملا کر پڑھنا چاہیے تاکہ مطلب، پڑھنے والے اور سننے والے کی سمجھ میں بہ خوبی آتا جاوے۔ اِس کے سوا اِن نشانوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس عبارت میں کون سا جملہ 'معترضہ' ہے اور کون سا 'استفہامیہ'۔کون

سا 'اقتباسیہ' اور کون سا 'ندائیہ'؛ کس مقام پر مصنف نے کوئی بات تعجب انگیز لکھی ہے اور کس مطلب پر مصنف نے پڑھنے والے کی زیادہ توجہ چاہی ہے، علیٰ ہٰذا القیاس۔
(علاماتِ قرأت، ص ۹)

ابوالکلام آزاد (زمانۂ اشاعت ۱۹۰۲ء)

انگریزی میں 'پنکچویشن' سے وہ علاماتِ قرأت مراد ہیں جو انگریزی میں عبارت کے سمجھنے اور پڑھنے کی تسہیل اور کلام کی کیفیت ظاہر ہونے کے لیے بنائے جاتے ہیں [کذا] جن سے 'قاری' کو معلوم ہو جاتا ہے کہ کس جگہ عبارت ختم ہوئی ہے، کہاں سکتہ کی ضرورت ہے، کس جملہ کو ملا کر پڑھنا چاہیے اور کس کو علیحدہ کر کے؟ کون جملہ، دعائیہ ہے اور کون جملۂ ندائیہ، کون استفہامیہ، کون جملہ، تعجب ظاہر کرتا ہے اور کون توجہ چاہتا ہے؟ ان علامات سے پڑھنے میں اس قدر سہولت ہوتی ہے کہ قاری بہتے ہوئے پانی کی طرح فرفر عبارت صحت کے ساتھ پڑھ لیتا ہے؛ گویا: یہ اشارے پڑھنے والے کو جلد جلد تعلیم کرتے آتے ہیں کہ اس جملے کو استفہامی اور اس کو تعجبانہ لہجے سے پڑھو؛ جس سے پڑھنے والے کو تفہیم اور سننے والے کو لطف حاصل ہوتا ہے۔
(پنکچویشن ماہنامہ خدنگ نظر، لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۰۲ء،
مشمولہ ارمغان آزاد، ص ۱۸۳)

سید ممتاز علی (زمانۂ اشاعت ۱۹۱۸)

جن جن قوموں کو اپنے اپنے علم و ادب کی ترقی کی فکر ہے انھوں نے چند علامات قرأت مقرر کی ہیں، جن کے ذریعے سے عبارت کو نہایت صحت، درستی و آسانی سے پڑھنے میں مدد ملتی ہے اور سننے والے کو مطالب کے سمجھنے میں نہایت سہولت ہوتی ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عبارت کا ایک مضمون کہاں سے شروع ہوا اور کہاں ختم ہوا

اور نیز یہ کہ لکھنے والا کس حصۂ عبارت پر پڑھنے والے کی زیادہ توجہ چاہتا ہے۔ کہاں استفہام مقصود ہے اور کہاں اظہارِ تعجب، کون سا جملہ معترضہ ہے اور کون سا اقتباسیہ۔ غرض پڑھنے کے وقت ان نشانات کی مدد سے مطالب کے سمجھنے اور سمجھانے میں نہایت آسانی ہو جاتی ہے اور ایسا نہیں ہونے پاتا کہ پڑھنے میں اِدھر کا فقرہ اُدھر ملا لیا جائے اور اُدھر کا اِدھر۔ نہ یہ کہ جن الفاظ کو ملانا تھا، جنھیں علیحدہ کر دیا جائے اور انھیں علیحدہ کرنا تھا انھیں ملا دیا جائے۔

(کہکشاں، لاہور اکتوبر ۱۹۱۸ء)

عبدالحق (زمانۂ اشاعت ۱۹۲۶ء)

اوقاف، یا وقفے ان علامتوں کو کہتے ہیں جو ایک جملے کو دوسرے جملے سے یا کسی جملے کے ایک حصے کو دوسرے حصوں سے علیحدہ کریں۔ اِن اوقاف کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اول تو ان کی وجہ سے نظر کو سکون ملتا ہے اور وہ تھکنے نہیں پاتی؛ دوسری بڑی بات یہ ہے کہ ذہن ہر جملے یا جزوِ جملہ کی اصل اہمیت کو جان لیتا ہے اور مطالب سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

(قواعدِ اردو، ص ۲۳۷)

محمد نعیم الرحمٰن الہ آبادی (زمانہ اشاعت ۱۹۳۶ء)

اوقاف قرأت سے میری مراد ان علامات سے ہے، جو تحریری فقروں میں الفاظ کے مابین لکھے جاتے ہیں، اور جن سے جملوں کی تقسیم ہوتی ہے اور گفتگو کے صحیح مضمون اور مفہوم کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ان علامتوں کے ذریعے ایک طرف تو پڑھنے والے کی آنکھ لفظوں اور جملوں کی تقسیم کو عبور کرتے ہوئے ذہن کی راہبری کرتی ہے؛ دوسری طرف ذہن مسلسل اور مربوط طور پر تقریر کا مفہوم اور مطلب آسانی اور صحت کے ساتھ اخذ کر لیتا ہے۔ اس طرح کہنے والے کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ میری گفتگو کا مدعا

صحیح سمجھا جا رہا ہے اور پڑھنے والا بجائے خود ہر طرح غلط فہمی سے بچ جاتا ہے۔ ان اوقاف کی مدد سے تحریر میں تقریر کرنے والے کی آواز کا اتار چڑھاؤ بخوبی اور صحیح طور پر سمجھ میں آجاتا ہے۔

(ہندوستانی، الہ آباد، جولائی ۱۹۳۶ء)

غلام رسول (زمانۂ اشاعت ۱۹۶۰ء)

تحریری عبارت کا مطلب سمجھنے کے لیے لفظوں اور جملوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے میں جو ٹھہراؤ کی علامتیں استعمال کی جاتی ہیں، وہ رموزِ اوقاف کہلاتی ہیں۔

(اردو املا، ص ۴۸)

غلام مصطفیٰ خاں (زمانۂ اشاعت ۱۹۷۳ء)

اوقافِ قرأت سے مراد وہ علامات و رموز ہیں جو تحریری فقروں میں الفاظ کے مابین لکھے جاتے ہیں اور جن سے جملوں کی تقسیم ہوتی ہے اور صحیح مفہوم کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اوقاف کی قرآنی علامات، الف بائی حروف پر مشتمل ہیں۔ دوسری صورت محض اشاری علامات کی ہے جو مغرب میں رائج ہوئی اور اب اردو میں بھی رائج ہے۔

(جامع القواعد، ص ۲۰۱)

گیان چند (زمانۂ اشاعت ۱۹۹۰ء)

یہ ترجمہ ہے Punctuation کا، یعنی نشاناتِ قرأت جن سے پڑھنے میں سہولت رہتی ہے۔ اوقاف جمع ہے وقفہ کی۔ رموزِ اوقاف کے معنی ہیں: وقفوں کی علامتیں ۔ انگریزی میں نشاناتِ اوقاف بہت زیادہ ہیں، اردو میں بہت کم ہیں۔ اردو کا اصلاً نشان تو ایک چھوٹی ڈیش تھا جو فل اسٹاپ کے لیے استعمال ہوتا تھا؛ اب

انگریزی سے کئی لے لیے گئے ہیں جن میں سے کچھ زیادہ مقبول ہیں، کچھ کم۔ ذیل میں ان کا اردو ترجمہ دینے کے بجائے اصل انگریزی نام ہی دیا جارہا ہے۔ مولوی عبدالحق نے جو ترجمے کیے تھے ان میں سے قوسین اور رواوین کے علاوہ اردو میں بقیہ نہ چل سکے۔

(تحقیق کا فن، ص: ۲۸۵، ۲۸۶)

عرض مرتب (زمانہ تحریر، دسمبر ۲۰۲۳ء)

گیان چند نے اپنے بیان میں دو باتیں خلافِ حقیقت لکھی ہیں:

(۱) ''اردو کا اصلاً نشان تو ایک چھوٹی ڈیش تھا جو فل اسٹاپ کے لیے استعمال ہوتا تھا۔'' یہ بیان درست نہیں۔ یہ چھوٹا ڈیش فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات میں کاما کی جگہ بہ کثرت استعمال ہوا ہے؛ لیکن ختمہ یعنی ڈیش کے طور پر نہیں۔ ہاں یہ درست ہے کہ اس علامت کو استعمال میں لانے کی تجویز سب سے پہلے صہبائی نے دی اور اس کا نام ''مد'' رکھا۔ خود بھی اپنے رسالے میں کہیں کہیں اس کا استعمال کیا؛ لیکن یہ رواج میں ۱۹۲۶ء کے بعد سے آیا جب مولوی عبدالحق نے نقطہ یعنی انگریزی فل اسٹاپ کی جگہ اسے اختیار کیا۔

(۲) ''مولوی عبدالحق نے جو ترجمے کیے تھے، ان میں سے قوسین اور رواوین کے علاوہ اردو میں بقیہ نہ چل سکے۔''— یہ بیان بھی درست نہیں۔ ۱۹۲۶ء کے بعد اردو نصابِ تعلیم اور قواعد کی کتب میں مولوی صاحب کے مجوزہ نام ہی اختیار کیے گئے۔ پچھلے تیس چالیس سال کے دوران اردو کی تعلیم 'براہِ اسکول و کالج عام ہوئی ہے، مکتب کا تصور ختم ہوگیا ہے، لہٰذا انگریزی ناموں کا استعمال بھی بڑھ گیا ہے؛ لیکن ایسا نہیں ہے کہ کاما کہنے والا، لفظِ 'سکتہ' سے ناواقفِ محض ہو۔

سطور بالا میں رموزِ اوقاف کی تعریف میں سات مصنفین کے بیانات نقل کیے گئے۔ ان میں صہبائی اور سرسید کے علاوہ باقی لوگوں نے عموماً ایک ہی سی تعریف کی

ہے؛ یعنی یہ لفظوں اور جملوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں اور پڑھنے میں سہولت پیدا کرتے ہیں۔ یہ تعریفیں غلط نہیں لفظ بہ لفظ صحیح ہیں؛ لیکن صہبائی نے آواز کے متغیر ہونے سے جو توقف کی صورت پیدا ہوتی ہے اور گفتار کے لہجے سے جملوں کا مفہوم جس طرح بدلتا ہے، اس کی جو نشاندہی کی ہے وہ بہت کچھ غور کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ کیا ان اوقاف کے استعمال کے اصول طے کرنے میں گفتاری لہجے کو اہمیت دی گئی ہے؟ میرا خیال ہے شاید اس پر بہت زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ مولوی عبدالحق کے پیش کردہ نظامِ اوقاف نگاری کو درجہ استناد حاصل ہو گیا اور آج تک اسی کی گونج سنائی دیتی ہے۔

فکشن میں جس طرح مکالموں اور ڈرامائی کیفیات کو رموزِ اوقاف سے پُرزور اور قابلِ فہم بنایا جاتا ہے، کیا نثر کی دوسری اصناف میں ممکن نہیں؟ فکشن نگار ان کے استعمال پر محض اس لیے قادر ہوئے کہ وہ کرداروں کے گفتاری لہجے اور ان کی حرکات وسکنات کو پیش آمدہ واقعہ کے تناظر میں دیکھ لیتے اور سمجھ لیتے ہیں؛ بایں طور سماعی املا کی طرح اوقاف کو بھی حسبِ حال استعمال کر لیتے ہیں۔ لہٰذا ایک مصنف کے لیے ضروری ہے کہ وہ عبارت کے مفہوم، جملوں کے باہمی ربط، جملوں یا لفظوں میں پوشیدہ جذبات واحساسات کی کیفیات جانے بغیر اوقاف لگانے کا فیصلہ نہ کرے۔ صہبائی سے رشید حسن خاں تک مصنفین نے ان کے لیے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ ضرور پیشِ نظر رہیں؛ لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ تجاویز آپ کی عبارت کے لیے آخری ہوں۔ بعض مواقع پر مصنف کو جملے کی ساخت اور معنوی پرتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ یہاں کے لیے کون سی علامت مناسب اور درست ہے۔

ڈاکٹر ممتاز منگلوری (زمانۂ اشاعت، ۱۹۸۶ء):

رموزِ اوقاف کے بارے میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کے بغیر نہ تو زبان بامعنی ہو سکتی ہے، نہ جملوں میں سلاست، سادگی اور حسن پیدا ہو سکتا ہے اور نہ پڑھنے

میں سہولت میسر آسکتی ہے؛ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ کسی بھی عبارت میں، کسی مقام کے کم یا زیادہ وقفے کے لیے اور مطالب کی تکمیل یا جاری ہونے کا اظہار کرنے کے لیے استعمال کی جانے والی یہ وہ علامات ہیں جن کے وسیلے سے اس عبارت کے مفہوم کو اس کے صحیح مضمون میں سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور یہی ان علامات یا رموزِ اوقاف کی اہمیت ہے کہ ان کے استعمال کے بغیر یا صحیح استعمال کے بغیر معانی کچھ کے کچھ ہو سکتے ہیں، کئی کئی معانی نکل سکتے ہیں یا سرے سے عبارت بے معنی بن سکتی ہے اور ہر صورت میں ابلاغ کی صورت مسخ ہو جاتی ہے۔

(املا اور موزِ اوقاف کے مسائل، ص ۲۲۶)

اردو زبان میں رموزِ اوقاف کی موجودہ صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے مجھے یہ کہنے میں کوئی تردد نہیں کہ ہمارے اکثر اہلِ قلم اور اساتذہ نہ صرف یہ کہ رموزِ اوقاف کی اہمیت سے آشنا نہیں، بلکہ ان کے استعمال کے صحیح طریقے سے بھی آگاہ نہیں۔ ہماری مطبوعات خواہ وہ یک روزہ نوعیت کی ہوں یا دائمی، تفریحی اور ادبی ہوں یا علمی، دینی ہوں یا درسی؛ رموزِ اوقاف کے صحیح استعمال کے معاملے میں بری طرح عدم توجہی کا شکار دکھائی دیتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اکثر مصنفین اپنی تحریروں میں رموزِ اوقاف کا صحیح استعمال نہیں کرتے، خواہ ایسا رموزِ اوقاف کی اہمیت ناشناسی کی بدولت ہو یا ان کا صحیح استعمال نہ جاننے کی وجہ سے۔ دوسری وجہ وہ ایڈیٹر اور پروف ریڈر صاحبان ہیں جو ایڈیٹنگ کے وقت اور پروفوں کی پڑتال کرتے وقت ان کی صحت کو مدنظر نہیں رکھتے۔ اس طرح کچھ غلطیاں مصنف کی، کچھ ایڈیٹر کی، کچھ کاتب یا خوش نویس کی اور کچھ پروف ریڈر صاحبان کی، سب مل ملا کر کتاب میں رموزِ اوقاف کا وہ نادر نمونہ پیش کرتی ہیں جو دیدنی ہے۔

(حوالۂ سابق، ص ۲۲۸)

ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی (زمانۂ اشاعت ۱۹۸۶ء)

اردو میں انگریزی اوقاف کے رواج کو کم وبیش سو سال کا عرصہ ہو رہا ہے؛ لیکن ابھی تک اس کے استعمال کی صورت زیادہ اطمینان بخش نہیں ہے۔ لوگ ان کے استعمال میں سنجیدہ نظر نہیں آتے۔ ہماری کتابوں میں بھی اس امر کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی۔ اگر رموزِ اوقاف کا استعمال کتابوں میں ہو بھی رہا ہے تو اس میں یکسانیت مفقود ہے۔ ان کا استعمال زبان کی ترقی کی دلیل ہے؛ لہٰذا اس طرف لوگوں کو متوجہ کرنا بے حد ضروری ہے۔ سب سے پہلے درسی کتابوں میں ان کے یکساں معیار کو یقینی بنایا جائے، تاکہ اردو کا طالب علم شروع ہی سے ان علامات کا عادی ہو جائے۔ یہ معاملہ یہیں تک نہیں رہنا چاہیے، طلبہ کو یہ تربیت دی جائے کہ وہ اپنی تحریروں میں بھی ان علامات کو استعمال کریں۔ عام کتابیں بھی رموزِ اوقاف کے بغیر شائع نہیں ہونی چاہئیں؛ طباعت سے پہلے تربیت یافتہ (ایڈیٹر) سے ان کی تدوین کرائی جائے۔

(املا و رموزِ اوقاف کے مسائل، ص: ۱۷۰-۱۷۱)

عرض مرتب (دسمبر ۲۰۲۳ء)

اس وقت ۲۰۲۳ء میں کیا یہی صورت حال ہے یا ہم نے اپنی سہل پسندی اور لاپروائی پر کچھ قابو پالیا ہے۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

محمد حسن خاں (زمانۂ اشاعت ۱۹۸۶ء)

(۱) رموزِ اوقاف صرف وہیں استعمال کیے جائیں جہاں ان کی حقیقی ضرورت ہو (یعنی ان سے صحیح مفہوم واضح ہوتا ہو یا حسن، معنویت، اہمیت اور زور سمجھنے اور ابہام یا اشتباہ یا تعقید دور کرنے میں مدد ملتی ہو)

(۲) محض کتابی یا طباعتی حسن بڑھانے کے خیال سے ان کا استعمال ہرگز نہ کیا جائے۔

(۳) ان کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے پوری پوری کوشش کی جائے، کیونکہ ان کے استعمال سے مطلب بالکل تبدیل یا خبط ہوسکتا ہے۔

(حوالۂ سابق، ص ۲۰۰)

○

ختمہ/ڈیش Full Stop (۔)

صہبائی (زمانۂ اشاعت ۱۸۴۵ء)

بیان 'مد' ۱۲ کا، جبکہ ایک فقرہ اس طرح سے تمام ہو جاوے کہ دوسرے فقرے سے اس کو تعلق نہ ہو، تو اس کے اخیر میں 'مد' کا نشان کرتے ہیں؛ مثلاً:

- آج اس مدرسہ میں دو تین طالب علم، تحصیلِ علم کے واسطے وارد ہوئے ہیں۔
- میں نے آپ کی خدمت میں چند بار عرض کیا کہ اگر آپ مہربانی کریں تو میرا مطلب بہ سہولت و آسانی حاصل ہو جاوے؛ لیکن آپ نے اس التماس کو قبول نہ کیا۔

اور بعض مطلب ایسا جدا اور علیحدہ، مطلبِ اول سے ہوتا ہے کہ اول سے ثانی کو کچھ علاقہ نہیں ہوتا؛ بلکہ وہ ایک مطلب دوسرا شروع ہوتا ہے، فقط مد کی نشانی پر کفایت نہیں کی جاتی؛ بلکہ سفیدی بہت چھوڑی جاتی ہے تا کہ بہ سبب اس کے توقف بہت کیا جاوے۔

(رسالۂ صرف و نحوِ قواعدِ اردو، ص ۱۰)

سرسید (۱۸۷۴ء)

فل اسٹاپ یعنی علامتِ وقفۂ کامل۔ یہ علامت اس بات کی ہے کہ یہاں فقرہ پورا ہو گیا۔

(۱) جب کوئی مفرد جملہ چھوٹا ہو، تو اس کے اخیر میں علامتِ وقفۂ کامل لگانی چاہیے؛
مثال: زندگی کی کوئی حالت تکلیف سے خالی نہیں۔

(۲) جب کوئی فقرہ ترتیب معانی میں پورا ہو جاوے، تو وہاں بھی علامتِ وقفۂ کامل لگانی چاہیے؛ مثال: ناامیدی سے اور آزمائش میں پڑنے سے ہمارے دلوں کا جوش کم ہو جاتا ہے۔

(۳) جب کسی لفظ کو اختصار کر کے لکھیں، تو اس کے بعد بھی علامت وقفۂ کامل لگانی چاہیے؛ مثال:

اِلخ- جو اختصار ہے الیٰ آخرہٖ کا، ہف- جو اختصار ہے ہٰذا خلف کا، بی-اے- جو اختصار ہے بیچلر آف آرٹ کا، ایم-اے- جو اختصار ہے ماسٹر آف آرٹ کا، سی-ایس-آئی- جو اختصار ہے کمپینین آف دی آرڈر آف دی اسٹار آف انڈیا کا۔

(علاماتِ قرأت، ص: ۱۳، ۲۰، ۲۱)

عرض مرتب (دسمبر ۲۰۲۳ء):

اردو میں انگریزی فل اسٹاپ (.) نقطے کی جگہ چھوٹا خط (۔) استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ سرسید سے بہت پہلے ۱۸۴۵ء میں صہبائی کے یہاں بھی یہ چھوٹا خط نظر آتا ہے جسے وہ مد سے موسوم کرتے ہیں۔ اردو میں فل اسٹاپ کو ڈیش کہا گیا ہے؛ لیکن سرسید نے اسے نقطہ کے طور پر متعارف کرایا ہے اور مثالوں میں بھی نقطے ہی کا استعمال کیا تھا۔ ہم نے نقطوں کو چھوٹے خط یعنی ڈیش سے بدل دیا ہے۔

عبدالحق (۱۹۲۶ء)

ختمہ (۔)

۱- یہ علامت مکمل جملے کے خاتمے پر لگائی جاتی ہے، جہاں ٹھہراؤ بھرپور ہوتا ہے:

● دنیا دارالعمل ہے۔
● جب طبیعت خراب ہو تو کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

۲- مخففات کے بعد بھی یہ علامت لگا دیتے ہیں: کے۔سی۔آئی۔ای۔، بی۔اے۔ صرف انگریزی کے مخففات کے بعد۔عربی کے مخففات کے بعد اکثر نہیں لگاتے: ص، صلعم، عہ، رضؓ، یوں ہی لکھے جاتے ہیں۔(جب ایک سے زیادہ مخففات ایک ہی سلسلے میں لکھے جائیں تو ہر مخفف کے بعد سکتے کی علامت دینا چاہیے):

(الف) ڈاکٹر محمد اقبال ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی، بیرسٹرایٹ لا۔
(ب) ہزا گز الٹڈ ہائی نس میر عثمان علی خاں بہادر، جی۔سی۔ایس۔آئی، جی۔سی۔ بی۔ای،

(قواعدِ اردو، ص: ۲۴۵، ۲۴۶)

غلام رسول (۱۹۶۰ء)

ختمہ کا استعمال: (۱) ہر جملے کے آخر میں۔(۲) مخففات کے بعد ہوتا ہے، مثلاً:
● خدا سب کو روزی دیتا ہے، وہی جلاتا اور مارتا ہے۔
● ایم۔بی۔بی۔ایس۔سی

(اردو املا، ص ۵۳)

فرمان فتحپوری (۱۹۷۷ء)

ختمہ۔(Full Stop) کا نشان اِن جگہوں پر استعمال ہوگا۔
(الف) جملے کے خاتمے پر؛ جیسے:
ہمارے گھر کے سامنے ایک پارک ہے۔ یہ پارک بہت خوبصورت ہے۔ ایک

مالی اس کی دیکھ بھال کے لیے مقرر ہے۔

(ب) مخففات کے بعد؛ جیسے:

۱- ایم۔ اے۔، پی ایچ۔ ڈی
۲- بی۔ اے۔، بی۔ ایڈ
۳- ایم۔ بی۔ بی۔ ایس
۴- ج۔ س۔ ی۔ ف (جواب سے یاد فرمایئے)
۵- ن۔ م۔ راشد
۶- ش۔ ضحیٰ

(اردو املا اور رسم الخط، ص۴۴)

گیان چند (۱۹۹۰)

فل اسٹاپ: انگریزی میں یہ محض ایک نقطہ ہوتا ہے؛ لیکن چونکہ اردو میں صفر کو نقطے کی شکل میں لکھا جاتا ہے، اس لیے فل اسٹاپ کو ڈیش کی شکل میں لکھا جاتا ہے۔ اردو میں یہ چھوٹی لکیر (-) انگریزی فل اسٹاپ اور ڈیش دونوں کے لیے مستعمل ہے؛ یعنی یہ جملے کے آخر میں ہوتی ہے، نیز عنوانات، فہرستِ مطالب، حوالوں اور کتابیات وغیرہ میں ایک اندراج کے ختم ہونے کو ظاہر کرتی ہے؛ مثلاً:

- غالب کا دیوان ان کی زندگی میں پانچ مرتبہ شائع ہوا۔
- اوقاف۔ یہ ترجمہ ہے پنکچوئیشن کا۔
- درد، خواجہ میر، دیوان درد۔ مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی۔ مجلس ترقی ادب۔ لاہور۔ ۱۹۶۰ء
- ڈاکٹر محمد اقبال ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔

عرض مرتب (۲۰۲۳ء)

مخففات کے سلسلے میں سر سید اور مولوی عبدالحق کی تجویز ہے کہ مخفف کے آخری حرف کے بعد بھی ڈیش لگایا جائے، جیسے: بی۔اے۔، ایم۔اے۔لیکن غلام رسول اور فرمان فتحپوری آخری حرف کے بعد کوئی علامت نہیں لکھتے۔میرا خیال ہے کہ لگا تار ڈگریوں کے اندراج کے دوران ہر ڈگری کے بعد بجائے ڈیش کے کاما دینا چاہیے:
بی۔اے،ایم۔اے،پی ایچ۔ڈی

ڈگری کے آخری حرف کے بعد ڈیش دینا ضروری نہیں، اگر ڈگری کے آخری حرف کے بعد کوئی عبارت آ رہی ہو تو ڈیش دے دینا چاہیے۔

مولوی عبدالحق، پی ایچ۔ڈی، تینوں حروف کے بعد ڈیش لگاتے ہیں یعنی پی۔ ایچ۔ڈی، جبکہ فرمان فتح پوری اور گیان چند انگریزی اصول کے مطابق صرف 'پی' (P) کے بعد ڈیش دیتے ہیں، 'ایچ ڈی' کو متصل لکھتے ہیں۔یہی طریقہ درست ہے۔پی۔ ایچ ڈی۔

گیان چند نے حوالہ جات اور کتابیات میں بھی ڈیش استعمال کرنے کی مثال دی ہے: دیوان درد۔خلیل الرحمٰن داؤدی۔مجلس ترقی ادب، لاہور۔۱۹۶۰ء۔

خاکسار کا خیال ہے کہ حوالہ جات اور کتابیات میں ڈیش یا ختمہ کا نہیں بلکہ سکتہ کا استعمال کرنا چاہیے؛ مثلاً:

مقالاتِ حافظ محمود شیرانی، جلد اول، طبع مجلس ترقیِ ادب لاہور، ۱۹۶۶ء
نقوش سلیمانی، سید سلیمان ندوی، طبع اردو اکیڈمی سندھ کراچی
شبلی کی ادبی وفکری جہات، ڈاکٹر شمس بدایونی، ناشر دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء
مقدمہ، رسالۂ صرف ونحوِ قواعدِ اردو، شیخ امام بخش صہبائی، مطبع نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۸۸۰ء، ص: ۱۳

اگر کتاب سے پیشتر مصنف کا نام لکھا جائے تو مصنف کے نام کے بعد ختمہ یعنی ڈیش اور آگے کے اندراجات کے بعد سکتہ (،) کا استعمال کرنا چاہیے؛ جیسے: شمس بدایونی۔ مزارِ غالب، غالب اکیڈمی دہلی، ۲۰۱۱ء

محمد اقبال سلمان (۱۹۵۹ء)

ختمہ: انگریزی میں مخففات کے بعد بھی ختمے کی علامت لگائی جاتی ہے؛ جیسے: بی۔اے، ایم۔اے، کے۔سی۔ایس۔آئی وغیرہ؛ لیکن اردو میں اس کی پیروی محض تکلف ہے۔اس کے بجائے یہ ہونا چاہیے کہ ایک سلسلے کے مخففات کے درمیان کوئی علامت نہ دی جائے؛ مثلاً:

(۱) بی اے۔ (۲) کے سی ایس آئی۔ (۳) ایم ایل اے۔ البتہ اگر مخففات کے سلسلے، ایک سے زیادہ ہوں تو ہر سلسلے کے بعد وقف کی علامت لگا دینی چاہیے؛ جیسے:

(۱) پروفیسر پرسی ڈبلیولونگ، ایم اے، پی ایچ، ڈی۔

(۲) ڈاکٹر فارسٹ لنٹ، ایم بی، ڈی ایم ڈی۔

(مضمون: رموز او قاف مشمولہ صحیفہ (۱۲) لاہور [۱۹۵۹ء])

عرضِ مرتب (دسمبر ۲۰۲۳ء):

محمد اقبال سلمان کی اردو مخففات کے سلسلے میں یہ تجویز بڑی مناسب ہے۔ انگریزی میں لفظ سالم حروف سے تشکیل پاتے ہیں؛ مثلاً: Ahmad اس لیے وہاں حروف کے بعد ڈیش لگانا ناگزیر ہے؛ جبکہ اردو میں سالم حروف میں بہت کم لفظ ہیں، ڈگریاں تو سالم حروف میں لکھی ہی نہیں جاسکتیں، لہٰذا ختمہ یعنی ڈیش سے اگر چھٹکارا پا لیا جائے تو یہ خلافِ آدابِ اوقاف نہیں ہوگا۔

سکتہ/ کاما Comma (،)

صہبائی (۱۸۴۵ء)

واو [یعنی سکتہ] کا بیان۔ جاننا چاہیے کہ فقرہ مفرد ہے یا مرکب: مفرد وہ ہے کہ اول سے آخر تک کہیں توقف واقع نہ ہو، مثلاً: کل اپنے دوستوں سے ملاقات کروں گا۔ اور مرکب وہ ہے کہ کئی فقروں مفرد سے مل کر ایک فقرہ حاصل ہوا ہو۔ پس جتنے اجزا اس کے ہوں ان سب پر واو لکھے جاوے [جاویں] تا کہ وہ اجزا ایک دوسرے سے ممتاز ہوجاویں اور وہ فقرے مفرد، جو فقرۂ مرکب کے اجزا ہوتے ہیں خواہ جملہ بالفعل[۱۳] ہوں خواہ بالقوۃ[۱۴]۔ مثال جملۂ بالفعل کی: ایک شخص جو کل راہ میں ملاقی ہوا تھا، یعنی بھائی زید کا، آج میرے گھر آیا تھا۔ یہ تمام ایک فقرہ، مرکب ہے اور اس کے اجزا یعنی جو کل راہ میں ملاقی ہوا تھا اور یعنی بھائی زید کا اور آج میرے گھر آیا تھا تب [سب] علیحدہ علیحدہ جملہ بالفعل ہیں۔ اور چونکہ ہر جگہ ایک توقف واقع ہوا ہے اس واسطے علامت واو کی لکھی گئی۔ مثال جملۂ بالقوہ کی: میری بھلائی برائی رنج راحت سب تم پر واضح ہیں۔ یہ واقع میں اس طرح سے ہے کہ میری بھلائی سب تم پر واضح ہے، میری برائی سب تم پر واضح ہے۔ میرا رنج سب تم پر واضح ہے، میری راحت سب تم پر واضح ہے ان کے امتیاز کے واسطے بھی واو علامت کی رقم ہوئی۔ اور جب کہ حرفِ عطف بیچ میں

آجاوے تو اس کو اس قاعدے سے مستثنیٰ کیا جاتا ہے، اور وہاں سے واو علامت کی ترک کی جاتی ہے؛ مثلاً: علم اور جہل ایک جگہ جمع نہیں ہوتے یا کوئی شخص کمال علم کو نہیں پہنچتا بغیر محنت اور مشقت کے۔

(رسالۂ صرف ونحوِ قواعدِ اردو، ص ۹، ۱۰)

سر سید (۱۸۷۴ء)

(،) کاما یعنی علامت سکتہ۔ انگریزی میں اس کی یہ شکل ہے (،) مگر یہ حرف واو کے مشابہ تھا اس لیے اس کو اُلٹ دیا تاکہ حرف مفرد تہجی سے مشابہت نہ رہے۔

اس علامت سے جملے کے ایسے حصے علیحدہ علیحدہ معلوم ہوتے ہیں جو مطلب میں تو ملے ہوئے ہیں، مگر پڑھنے میں ان مقاموں میں ذرا سا سکتہ کر کر پڑھنا چاہیے۔

(۱) جب کسی مفرد جملہ میں مبتدا اور خبر[۵] مرکب ہوں تو ان کے بیچ میں علامت سکتہ لگانی چاہیے۔

مثال: کسی چیز کی طرف مستقل اور پوری توجہ، اعلیٰ طبیعت کی نشانی ہے۔

(۲) جملۂ مرکبہ کے اجزائے مفردہ بذریعۂ علامتِ سکتہ علیحدہ کرنے چاہئیں تاکہ پڑھنے میں الگ الگ پڑھے جاویں۔

مثال: جب اچھائی نہیں رہتی، تو لوگوں کی توجہ بھی نہیں رہتی۔

بہادروں نے، جب دشمنوں کا حال سنا، تو ان پر نہایت دلیری سے حملہ کیا۔

مگر جب جملہ کے اجزا ایسے ہوں کہ خود انھیں سے ان میں ترکیب پائی جاتی ہو، تو وہاں علامت سکتہ کا لگانا کچھ ضروری نہیں ہے۔

مثال: خود ہمارا دل ہم کو بتاتا ہے کہ اصلی نیکی کیا ہے۔

(۳) معطوف و معطوف علیہ[۶] میں جب حرف عطف موجود ہو تو وہاں بھی علامت سکتہ لگانی ضروری نہیں۔

مثال: زمین اور چاند دونوں سیارے ہیں۔

عقلمند آدمی وقت کی قدر کرتا ہے اور اس کو ضائع نہیں کرتا۔

کامیابی اکثر ہوشیاری اور ہمت سے کام کرنے پر منحصر ہوتی ہے۔

مگر جب معطوف و معطوف علیہ میں حرف عطف موجود نہ ہو تو وہاں علامت لگانی ضروری ہے۔

مثال: عقل، ہوش، علم، ہنر سب وقت پر کام آتے ہیں۔

وہ تو سیدھا، سادا، ایماندار آدمی ہے۔

مستثنیٰ اور مستثنیٰ منہ کے درمیان میں بھی علامت سکتہ کا لگانا ضروری ہے۔

مثال: وہ شخص ایماندار ہے، مگر سست۔

بہت بڑا عالم ہے، مگر بے عمل۔

پرہیزگار ہے، مگر ظاہری باتوں میں۔

جب متعدد صفتیں کسی اسم کی، بغیر حرفِ عطف کے بیان کی جاویں کہ ایک صفت دوسری صفت کی تشریح کرتی ہو، تو ان میں علامت سکتہ نہیں لگانی چاہیے:

مثال: بھوراسیاہی مایل کپڑا، ہلکا زردی مایل سبز رنگ

اگر حرف عطف موجود ہو، مگر جملہ کے اجزا لمبے لمبے ہوں تو بھی ان میں علامت سکتہ لگانی چاہیے۔

مثال: بے اعتدالی ہمارے جسم کی قوت کو ضائع کرتی ہے، اور ہمارے دل کی جرأت کو۔

(۴) جبکہ تین یا تین سے زیادہ الفاظ ایک ہی جزوِ کلام میں ہوں، اور اس میں حرف عطف ہو خواہ نہ ہو ان لفظوں کے اخیر میں بھی، سوائے اس لفظ کے جو سب سے اخیر ہو؛ علامت سکتہ لگانی چاہیے؛ لیکن اگر وہ اخیر کا لفظ اسم ہو تو اس کے بعد بھی علامت سکتہ ہونی چاہیے۔

مثال: نظم، موسیقی، مصوری، عمدہ ہنر ہیں۔

خرم ایک دلیر، دانا اور دوراندیش شہزادہ تھا۔

جبکہ جملہ میں دو دو لفظ ساتھ ساتھ ہوں، تو ہر دو کے بعد علامت سکتہ ہونی چاہیے۔

مثال: بے بندوبستی اور بدانتظامی، مفلسی اور محتاجی، تکلیف اور مصیبت، ویرانی و بربادی، آپس کی نااتفاقیوں کا نتیجہ ہے۔

(۵) جملۂ ندائیہ کے بعد بھی علامتِ سکتہ ہونی چاہیے۔

مثال: میرے پیارے، میری بات سن۔

او جانے والے، ادھر ہوتا جا۔

جاگنے والو، جاگتے رہو۔

(۶) جملۂ بیانیہ، فقرۂ مفرد کے شروع میں ہو، خواہ بیچ میں، خواہ اخیر میں، اس کے ساتھ بھی علامت سکتہ ہونی چاہیے۔

مثال: ان کی نیکی، احسان مندی سے، مجھے یاد ہے۔

ان کی نیکی مجھے یاد ہے، نہایت احسان مندی سے۔

احسان مندی سے، ان کی نیکی مجھے یاد ہے۔

(۷) جب کسی جملہ میں دو اسم آویں، اور پچھلا اسم مع اپنے متعلقات کے، اسی شخص یا چیز پر دلالت کرے جس پر پہلا اسم دلالت کرتا ہے تو ان کے درمیان میں بھی علامت سکتہ لگانی چاہیے۔

مثال: احمد، خیرخواہِ معاندان۔

مگر جب کئی لفظ مل کر ایک مرکب اسم بنے، تو ان لفظوں کے درمیان میں علامت سکتہ نہ ہونی چاہیے۔ مثال:

شاہ جہاں آباد	اکبر آباد	الہ آباد
چتور گڑھ	مشکل کشا	نبی آخر الزماں
مشکل کشا علی		

(۸) اگر اسماے موصولہ ۱۸؎ کے بعد بھی جملۂ بیانیہ ہو، تو اس کے پہلے علامت سکتہ لگانی چاہیے؛

مثال: وہ، جو خم ہو کر پھر سیدھی ہو جاوے، اصیل تلوار ہے۔

مگر جبکہ اسماے موصولہ اسم کے ساتھ ملے ہوئے ہوں، تو اس وقت ان کے پہلے علامت سکتہ کا لگانا ضروری نہیں۔

مثال: جو تلوار خم ہو کر سیدھی ہو جاوے اصیل ہے۔

(۹) جب کسی جملہ کی ترکیب اُلٹ دی جاوے تو اس کے بیچ میں علامت سکتہ لگانی چاہیے۔

مثال: خدا کے نزدیک کوئی چیز مشکل نہیں ہے۔

اس مثال میں علامت سکتہ کی ضرورت نہیں ہے، مگر جب اس کی ترکیب اُلٹ دو تو علامت سکتہ کی ضرورت ہوگی۔

مثال: کوئی چیز مشکل ہے، خدا کے نزدیک۔

(۱۰) جب کوئی فعل محذوف ہو، تو وہاں علامت سکتہ لگانی چاہیے۔

مثال: پڑھنے سے آدمی پورا انسان ہوتا ہے، اور اچھی گفتگو سے، لایق اور لکھنے سے، قابل۔

(۱۱) کاف ۱۹؎ بیانیہ یا تردیدیہ کے پہلے علامت سکتہ لگانی چاہیے۔

مثال: ذوالفقار خاں آویں گے، کہ نہیں۔

نیک ہو، تا کہ خوش رہو۔

(علامات قرأت، ص۱۲، ۱۴-۱۸)

عبدالحق (۱۹۲۶ء)

سکتہ (،) یہ سب سے چھوٹا وقفہ ہے۔ یہ حسب ذیل موقعوں پر استعمال ہوتا ہے:

(۱) ایسے اسما یا ضمائر کے بیچ میں جو ایک دوسرے کے بدل کا کام دیتے ہوں؛ جیسے:
جہانگیر، ابنِ اکبر، شہنشاہِ ہندوستان نے جب . . .

(۲) ایک ہی قسم کے کلمے کے ان تین یا تین سے زیادہ لفظوں کے بیچ میں جو ساتھ ساتھ استعمال کیے گئے ہوں (اس حالت میں جب کہ یا تو صرف آخری دو لفظوں کے درمیان حرف عطف یعنی 'و' یا 'اور' یا حرفِ تردید یعنی 'یا' آئے) جیسے:

(الف) حیدر آباد، میسور اور ٹراونکور جنوبی ہند کی ریاستیں ہیں (ان میں تینوں الفاظ اسم ہیں)

(ب) چوری کرنا مذہباً، اخلاقاً اور رسماً برا سمجھا جاتا ہے۔ اس کا طرزِ عمل عامیانہ، جاہلانہ اور سوقیانہ ہے (ان میں تینوں الفاظ متعلقاتِ فعل ہیں)

(ج) اکبر بہت عقلمند، وسیع النظر، ہمدرد اور مدبر بادشاہ تھا۔ (یہاں صفات ہیں)

(۳) ندائیہ لفظوں کے بعد؛ جیسے:

(الف) جنابِ صدر، خواتین وحضرات (یہاں تینوں اسم منادی ہیں)

(ب) اے ماؤ، بہنو، بیٹیو (یہاں تینوں اسم منادی ہیں)

(ج) جناب من، تسلیم۔

(د) میرے محبّ صادق، وعلیکم السلام۔

(ہ) عزیز من، بہت بہت دعا۔

(۴) جب ایک ہی درجے یا رتبے کے لفظ جوڑوں میں استعمال ہوں تو ایک جوڑے اور دوسرے جوڑے کے درمیان سکتہ دیتے ہیں۔ دن ہو کہ رات، سفر ہو کہ حضر، خلوت ہو یا جلوت، انسان کو چاہیے کہ خدا کو نہ بھولے۔

(۵) ایسے اجزائے جملہ کے درمیان جو تشریحی ہوں سکتہ آتا ہے؛ جیسے:
یہ چبوترا ۳۰ فٹ لمبا، ۳۰ فٹ چوڑا، ۵ فٹ اونچا ہے۔

(۶) دو یا زیادہ ایک ہی درجے کے ایسے چھوٹے جملوں کے بیچ میں جو ایک بڑے

جملے کے جز ہوں:

(الف) میں گھر سے بازار گیا، بازار سے مدرسہ آیا، اب مدرسہ سے گھر واپس جاتا ہوں۔

(ب) کھیلنے کے وقت کھیلو، پڑھنے کے وقت پڑھو۔

(ج) وہ کھیل کے آیا، نہایا، کپڑے بدلے، چائے پی اور سیر کو چلا گیا۔

(د) [ع]: زبان بگڑی تو بگڑی تھی، خبر لیجے دہن بگڑا

(ہ) نہ نو من تیل ہوگا، نہ رادھا ناچے گی۔

(۷) شرط اور جزا۲۰ یا صلے اور موصول۲۱ کو بیان کرنے والے (سادہ جملوں کے بیچ میں)

(الف) [۔] اگر ہم جانتے داغِ جدائی، نہ کرتے اتنی الفت تم سے بھائی

(ب) اس کے منہ سے جو کوئی لگا، ذلیل ہی ہوا۔

(ج) جب مطلع صاف ہو گیا اور سورج نکل آیا، تو میں اپنے گھر سے نکلا۔

(د) جس شخص نے مجھ سے، آپ سے کل باتیں کیں، وہ زید تھا۔

(۸) ایسے سادہ جملوں کے بیچ میں جو مستثنیٰ اور مستثنیٰ منہ۲۲ کا بیان کریں۔

(الف) وہ شخص ایماندار ہے، لیکن سست۔

(ب) سارا زمانہ آیا، پر زید نہ آیا۔

(۹) جب ایک سادہ جملہ دوسرے کی توجیہ کرے تو دونوں کے بیچ میں سکتہ آتا ہے:

(الف) میں نہیں گیا، اس لیے کہ وہ خود ہی میرے ہاں آپہنچا۔

(ب) اسے گھر بیٹھے نوکری مل گئی، پھر باہر کیوں جاتا؟

(ج) خوب دوڑا کرو، جس میں بھوک اچھی طرح لگا کرے۔

(۱۰) جب کسی فعل کے بعد 'کر' یا 'کے' مقدر ہو تو سکتہ لگانا ضروری ہے۔

(الف) وہ چھری ہاتھ میں لے، نکل کھڑا ہوا۔

(ب) وہ یہ جا، وہ جا، چمپت ہوگئی۔

(۱۱) جب مبتدا اور خبر۲۳ کے بیچ میں کوئی حجاب نہ ہو تو سکتہ ضرور ڈال دیتے ہیں۔

(الف) یہی مجموعہ یا انتخابِ مضامین، مطبوعہ رسالے کا، نہایت عمدہ اشتہار بھی بن گیا ہے۔

(ب) حالی، مسدسِ حالی کے مصنف ہیں۔

(ج) مسدس، حالی کی سب سے ممتاز تصنیف ہے۔

(د) نذیر احمد کی سب سے عام پسند کتاب، مراۃ العروس ہے۔

(۱۲) عبارت اور خصوصاً شعر کی تعقید دور کرنے کے لیے بھی سکتہ لگاتے ہیں۔

(الف) اس زمانے میں دین کی بات میں لوگ کتنی راہیں چلتے ہیں، کتنے، پہلوں کی رسموں کو پکڑتے ہیں، کتنے قصے بزرگوں کے دیکھتے ہیں، کتنے، مولویوں کی باتوں کو، جو انھوں نے اپنے ذہن کی تیزی سے نکالی ہیں، سند پکڑتے ہیں؛ اور کتنے، اپنی عقل کو دخل دیتے ہیں۔

(ب) [شعر] سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش، کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

(ج) [مصرعے] تارِ ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابرِ بہار

(د) ؍؍ کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی، عرض، کیا قدرت؟

(ہ) ؍؍ دیوار، بارِ منتِ مزدور سے، ہے خم

(و) ؍؍ ولے مشکل ہے، حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

(ز) ؍؍ نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے:
طراوتِ چمن و خوبی ہوا، کہیے

(۱۳) اور 'یا' وغیرہ سے پہلے جب ہی سکتہ لگاتے ہیں کہ لفظوں پر خاص طور پر زور دینا منظور ہو۔

(قواعدِ اردو، ص: ۲۳۸، ۲۴۰)

غلام رسول (۱۹۶۰ء)

سکتہ حسب ذیل موقعوں پر استعمال کیا جاتا ہے۔

۱- اسموں کے درمیان؛ مثلاً: گیہوں، چنا، چاول، میوہ، ساگ پات، دودھ اور گھی، انسان کی غذا کی خاص چیزیں ہیں۔

۲- فعلوں کے درمیان؛ مثلاً: کھانا، پینا، سونا اور ورزش کرنا، انسان کی زندگی کے لیے ضروری ہیں۔

۳- صفتوں کے درمیان؛ مثلاً: سلطان ناصر الدین بڑا نیک، خلیق، شجاع، عابد اور سخی تھا۔

۴- منادا کے بعد؛ مثلاً: جناب صدر! خواتین، حضرات اور عزیزو۔

۵- جملے کے فقروں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کے لیے؛ مثلاً: دن ہو کہ رات، سفر ہو کہ حضر، خلوت ہو یا جلوت، انسان کو چاہیے کہ خدا کو نہ بھولے۔

٦- چھوٹے چھوٹے جملوں کے درمیان؛ مثلاً: قافلہ دریاؤں کو عبور کرتا، دشوار گزار درّوں سے گزرتا، سخت بارش اور تیز دھوپ کی تکلیفیں اٹھاتا، جابجا سونے کی کان کی تلاش میں پھرتا رہا۔

۷- توضیحی فقروں کے درمیان؛ مثلاً: مکان کا ہال ۳۰ فٹ لمبا، ۱۰ فٹ چوڑا اور ۷ فٹ اونچا ہے۔

۸- (الف) شرطیہ (ب) موصولہ (ج) حمید ایماندار آدمی ہے، لیکن بے وقوف ہے۔ (د) شفیق کھیل میں شریک ہوا، حالانکہ وہ بیمار تھا۔ (ہ) راجا بکرماجیت نے مدت تک سیر و سیاحت کی، غیر ملک والوں کے علم و ہنر اور عقل و حکمت کو خوب دیکھا بھالا۔

۹- شعر کی تعقید دور کرنے کے لیے؛ مثلاً:

توڑ کر بت خانہ کو مسجد بنالی [بنا کی] تو نے شیخ!
برہمن کے دل کی بھی، کچھ فکر ہے، تعمیر کا

(اردو املا، ص: ۴۹، ۵۰)

غلام مصطفیٰ خاں (۱۹۷۳ء)

سکتہ: یہ سب سے چھوٹے ٹھہراؤ کی علامت ہے اور کثرت سے استعمال کی جاتی ہے؛ بالخصوص ایک ہی قسم کے کلمے کے ان تین یا تین سے زیادہ لفظوں کے بیچ میں جو ساتھ ساتھ استعمال کیے گئے ہوں۔ اس حالت میں یہ عطف کا بدل ہوتی ہے اور حرف عطف[۲۴] صرف آخری کلمے سے قبل لانا کافی ہوتا ہے؛ مثلاً: کتاب، کاغذ، قلم، دوات اور پنسل لو۔ نیز تشریحی اجزائے جملہ کے درمیان بھی اسی صورت سے آتی ہے؛ مثلاً: دس فٹ چوڑا، پندرہ فٹ لمبا اور دس فٹ اونچا کمرا۔

کسی مرکب جملے کے ذیلی جملوں کے درمیان بھی آتی ہے؛ مثلاً: چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا غریب، عورت ہو یا مرد، بوڑھا ہو یا جوان، اس اصول کی پابندی سب کے لیے ضروری ہے۔

سکتہ کی علامت، شرط و جزا[۲۵] یا صلہ و موصول[۲۶] کے جملوں کے درمیان میں بھی آتی ہے۔ نیز مستثنیٰ اور مستثنیٰ منہ[۲۷] کا بیان کرنے والے جملوں کے درمیان بھی لائے ہیں؛ مثالیں:

(۱) اگر آپ پوچھتے، تو میں ضرور سب حال کہہ سناتا۔

(۲) جو غرور کی چال چلا، وہ آخر کو ذلیل ہوا۔

(۳) مکان خوبصورت ہے، لیکن گنجائش میں کم۔

توضیحی فقروں کے قبل بھی سکتے کی علامت لاتے ہیں؛ مثلاً:

(۱) کتاب اچھی ہے، اس لیے کہ اس میں طول بیانی سے کام نہیں لیا گیا ہے۔
(۲) جو ہونا ہے، ہو رہے گا، پھر تردد سے کیا فائدہ۔ (اس مثال میں پہلا سکتہ صلہ وموصول کے جملوں کے مابین ہے، دوسرا توضیحی فقرے سے قبل)

علامت افعال متصلہ (کریا کے) مقدر ہو تو سکتہ لانا ضروری ہے؛ مثلاً:

ع-آئینہ دیکھ، اپنا سامنہ لے کے رہ گئے

مبتدا اور خبر کے درمیان کوئی اور لفظ نہ ہو تو فرق کرنے کے لیے سکتہ درمیان میں لانا چاہیے؛ مثلاً: یادگار غالب، حالی کی تصنیف ہے، غالب، غالب ہے۔

تعقید کو دور کرنے کے لیے بھی سکتہ لگاتے ہیں؛ مثلاً:

[ع] لوٹے ہے سبزے پہ، ازبس کہ ہوا ہے بیکل (سودا)

[ع] ہیں، بسکہ جوش بادہ سے، شیشے اچھل رہے (غالب)

(جامع القواعد، ص:۲۰۴، ۲۰۵)

فرمان فتحپوری (۱۹۷۷ء)

سکتہ —(Comma) حسب ذیل مقامات پر استعمال ہوگا۔

(الف) جب کسی جملے یا فقرے میں اعداد اور اسما وصفات کا ذکر اس طرح کیا جائے کہ آخری دو عدد یا اسموں کے درمیان 'اور' یا 'یا' کا لفظ لانا پڑے تو اس سے قبل کے ہر عدد اور اسم کے بعد، بطور عطف سکتہ کا نشان لگایا جائے گا؛ جیسے:

۱- حامد، محمود، راشد، ماجد اور امجد پانچوں بہت ذہین ہیں۔
۲- بازار جا کر ایک قلم، دو سرخ پنسلیں، ایک ربر، دو پیڈ یا کاپیاں لائیے۔
۳- مولانا حسرت موہانی نے شاعری کو عارفانہ، نافعانہ، فاسقانہ، عاشقانہ اور متصوفانہ وغیرہ کے خانوں میں تقسیم کیا ہے۔
۴- مولانا محمد علی جوہر سچے مسلمان، مخلص سیاست دان، شعلہ بیان مقرر، نامور صحافی

اور ایک ممتاز شاعر تھے۔

۵- اس سلسلے میں ادبی، تاریخی، معاشی، نفسیاتی، سیاسی اور ثقافتی پہلو بھی زیرِ بحث آئیں گے۔

(٦) ۲، ۳، ۵، ٦، ۷/اور ۹ نمبر کے کمرے خالی ہیں۔

(ب) ایک ہی قسم کے مرکبات اور لمبے جملے کے اجزا کے بعد؛ جیسے:

۱- میرا، آپ کا، شاہد کا، رشید کا اور وحید کا نام کامیاب امیدواروں کی فہرست میں شامل ہے۔

۲- آپ کا قلم، میری گھڑی، اسلم کا ریڈیو اور قدیر کا ٹی وی، چاروں جاپانی ہیں۔

۳- حامد کب آیا، کب گیا، کیا کہا، کیا سنا اور کس کس سے ملاقات کی مجھے کچھ نہیں معلوم۔

(ج) ندا اور مخاطبے کے لیے؛ جیسے:

۱- اے ماؤ، بہنو، بیٹیو۔

۲- محترم صدر، اساتذۂ کرام، دوستو اور عزیز طالب علمو۔

۳- انیسؔ، دم کا بھروسہ نہیں زمانے میں۔

(د) ایک ہی طرح کے جملوں کے بعد بطور عطف،؛ جیسے:

۱- میں نے اس کو بلایا، اونچ نیچ سمجھایا، برا بھلا کہا، خوف دیا، لیکن کسی بات کا کچھ اثر نہ ہوا۔

۲- آؤ، بیٹھو، کچھ ہماری سنو، کچھ اپنی سناؤ۔

(س ۲۸) ایسے جملوں کے بعد جن میں تکرار سے بچنے کے لیے فعل کو محذوف کر دیا گیا ہو؛ جیسے:

۱- امتحان میں حامد نے پہلی پوزیشن، محمود نے دوسری، راشد نے تیسری اور ماجد نے چوتھی پوزیشن حاصل کی۔

۲- حامد کو تمغا، محمود کو گھڑی، راشد کو قلم اور ماجد کو ایک کتاب انعام میں ملی۔

(ک) جب کسی اسم کی تعریف یا وضاحت میں کوئی بات کہی جائے تو اسم اور وضاحتی فقرے کے بعد سکتہ آئے گا؛ جیسے:

۱- اسلم، محمود کا بڑا بھائی، امریکہ سے واپس آ گیا ہے۔

۲- میری کتاب، غالب شاعرِ امروز و فردا، ۱۹۶۹ء میں چھپی تھی۔

۳- داستانِ تاریخ اردو، مولانا حامد حسن قادری کی مشہور تصنیف ہے۔

(ل) اشعار کے بعض لفظ یا ٹکڑے کے بعد اس لیے سکتے کا نشان لگاتے ہیں کہ تعقید پیدا نہ ہونے پائے اس کی مثالیں یہ ہیں:

(۱)

جھڑکی سہی، ادا سہی، چینِ جبیں سہی
سب کچھ سہی، پر ایک نہیں کی نہیں سہی

(۲)

کہتے ہو نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے، ہم نے مدعا پایا

(۳)

نینداس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

(۴)

واں وہ غرور و عز و ناز، یاں یہ حجاب و پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

(۵)

بھاگے تھے ہم بہت، سو اسی کی ہے یہ سزا
ہو کر اسیر، دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

(٦)

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر، اے سنگدل، تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

(٧)

یار سے، آبِ رواں، عکس ہجومِ گل سے
لوٹے ہے سبزے پہ ازبس کہ ہوا ہے بیکل

(م) کسی فعل کے بعد 'کر' یا 'کے' محذوف ہونے کی صورت میں؛ جیسے:

(۱) وہ کتاب بغل میں دبا، نہ جانے کدھر نکل گیا۔

(۲) وہ بھی عجیب آدمی ہے، صبح اٹھ، یہ جا، وہ جا، ذرا دیر میں غائب۔

(ن) شرط و جزا کے درمیان بشرطیکہ حرف شرط محذوف ہو؛ جیسے:

(۱) اگر میرا منھ کھلوایا، میں کھری کھری سنا دوں گی۔

(۲) جو تمہاری طرح، تم سے، کوئی جھوٹے وعدے کرتا
تمہیں، منصفی سے کہہ دو، تمہیں اعتبار ہوتا

(۳) جو تمہاری باتوں میں آیا، وہ گیا کام سے۔

(و) جملۂ موصولہ میں صلہ و موصول کے اجزا کے درمیان؛ جیسے:

۱- یہ بات، جس نے بھی آپ سے کہی غلط کہی۔

۲- چپ رہو، جو بھی سنے گا، کیا کہے گا۔

۳- جس جس سے ملاقات ہوئی، سب نے آپ کا ذکر کیا۔

(ہ) حرف استثنا[۲۹] حرف استدراک[۳۰] حرف توجیہ[۳۱] سے پہلے؛ جیسے:

۱- وہ ذہین و محنتی سہی، لیکن قابل اعتماد نہیں ہے۔

۲- جلسے میں سبھی پہنچ گئے، مگر آپ کو نہ پہنچنا تھا نہ پہنچے۔

۳- پُر ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے
۴- اسے پاکستان ہی میں اعلیٰ درجے کی ملازمت مل گئی، پھر باہر کیوں جاتا۔
۵- خوب محنت کرو، تاکہ امتحان میں اچھے نمبر حاصل کرسکو۔
۶- وہ ہر جگہ کامیاب رہے گا، اس لیے کہ محنتی بھی ہے ایماندار بھی۔
۷- حالِ دل لکھوں کب تک، جاؤں ان کو دکھلادوں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا

(اردو املا اور رسم الخط، ۴۴-۴۷)

گیان چند (۱۹۹۰ء)

کاما: انگریزی سے یہ سب سے زیادہ کام کی علامت ملی ہے۔ انگریزی کاما اردو کے [و] سے تشابہ پیدا کرسکتا تھا، اگر اسے قدرے اوپر کی طرف لکھا جاتا تو انجانے میں ضمہ یعنی پیش سمجھ لیا جاتا، اس لیے اردو میں اسے الٹ دیا گیا ہے۔ انگریزی ہو یا اردو، اس کی لمبائی دوسرے حروف سے چھوٹی ہوتی ہے، اس لیے انگریزی میں دوسرے حروف کے نصف زیریں کے برابر لگاتے ہیں۔ یعنی دوسرے حروف کی تختی سے قدرے اوپر۔ اس سے فقروں کو الگ کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اگر ایک شے کی انواع کا بیان ہو تو آخری نوع سے پہلے 'اور' کو چھوڑ کر بقیہ کو اسی سے جدا کرتے ہیں؛ مثلاً:

نثر کی چار قسمیں ہیں: سلیس سادہ، سلیس رنگین، دقیق سادہ اور دقیق رنگین۔ تدوینِ متن، بالخصوص مشکل متون مثلاً کربل کتھا، غالب کے منسوخ کلام وغیرہ میں اس کے وافر استعمال سے مفہوم کی وضاحت میں بہت مدد ملتی ہے۔ اس کے استعمال کی مثالیں اسی صفحے، بلکہ اسی پیراگراف میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

(تحقیق کا فن، ص ۲۸۷)

رشید حسن خاں (۱۹۹۴ء)

سکتہ: اِس کا انگریزی نام ''کاما'' زیادہ مشہور ہے۔ کاما کا استعمال بہت ضروری ہے۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ عبارت کے ٹکڑے اس طرح الگ نظر آتے ہیں کہ مطلب روشن ہو جاتا ہے۔ کاما خاص کر ایسے موقعوں پر آتا ہے:

(الف) جب دو یا زیادہ ایک ہی قسم کے کلمے ایک ساتھ آئیں۔ ایسی صورت میں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ پہلے ایک یا دو لفظوں کے بیچ میں کاما آتا ہے اور آخری لفظ سے پہلے ''اور'' یا ''یا'' آتا ہے؛ جیسے: وہ شخص تو بہت مکار، دغاباز اور بے ایمان ہے۔ یہ کتاب مفید، دلچسپ اور آسان ہے۔ تم تربوز، خربوزے یا کوئی اور پھل لیتے آنا۔

(ب) ندائیہ لفظوں کے بعد؛ جیسے: جنابِ صدر، خواتین وحضرات! اے ماؤ، بہنو، بیٹیو!

(ج) مختلف ٹکڑوں کے بیچ میں؛ جیسے: صبح ہو کہ شام، دن ہو کہ رات، خدا کو یاد کرنا چاہیے۔ آندھی ہو کہ پانی، روشنی ہو یا اندھیرا، تنہائی ہو یا محفل؛ ہر عالم میں خدا کو یاد کرتے رہنا چاہیے۔

(ج) ایک ہی ڈھنگ کے جملوں کے بیچ میں؛ جیسے: میں یہاں آیا، وہاں گیا، غرض دن بھر پھرتا رہا۔ کھیلنے کے وقت کھیلو، پڑھنے کے وقت پڑھو۔ جس نے اس سے جھگڑا کیا، وہ پریشانی میں پڑا۔ ان کو یہاں سب کچھ مل جاتا ہے، پھر وہ کہیں اور کیوں جائیں۔

(د) دو ناموں کے درمیان؛ جیسے: ہمایوں، ایران سے واپس آیا تھا۔ شعرالعجم، مولانا شبلی کی تصنیف ہے، حالی، مسدس کے مصنف ہیں، ایران، افغانستان سے ایک الگ ملک ہے۔

(ہ) اشعار میں ایسے مقامات پر کاما ضرور لگانا چاہیے جہاں لفظ آگے پیچھے ہو گئے

ہوں، یا ٹکڑوں کو الگ الگ کر دینے سے مطلب واضح ہو سکتا ہو؛ جیسے:

[ع] غم رہا، جب تک کہ دم میں دم رہا

[ب] سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں، کیا صورتیں ہوں گی، کہ پنہاں ہو گئیں

[ب] دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گذر پہ ہم، غیر ہمیں اٹھائے کیوں

[ع] نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے

[ع] نقش، فریادی ہے کہ کس کی شوخیِ تحریر کا

(عبارت کیسے لکھیں: ۲۹، ۳۰)

○

وقفہ/سیمی کولن Semicolon (؛)

صہبائی (۱۸۴۵ء)

صہبائی نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔

سرسید: (۱۸۷۴ء)

(؛) سیمی کولن یعنی علامت سکون۔انگریزی میں اس کی صورت یوں (;) ہے۔اس کو بھی الٹ دیا ہے۔ یہ علامت فقرہ کے ایسے اجزا علیحدہ کرنے کو لگائی جاتی ہے جو بہ نسبت ان اجزا کے جن میں علامت سکتہ لگاتے ہیں، آپس میں کم مناسبت رکھتے ہیں۔

(۱) جب کہ پہلا حصہ فقرہ کا پورا کلام ہو، مگر اس کے بعد کا حصہ ایسا ہو کہ اس سے کوئی نتیجہ پایا جاوے، یا پہلے حصہ کا مطلب بتاوے، تو ان میں علامت سکون لگانی چاہیے۔

مثال- ایمانداری سے اپنا کام کرو؛ کیونکہ اس سے تمہاری عاقبت سنورے گی۔

(۲) جب کئی چھوٹے جملے ایک دوسرے کے بعد آویں، اور باہم ان کے کچھ ضروری مناسبت نہ ہو، تو ان میں بھی علامت سکون لگانی چاہیے۔

مثال- ہر چیز پرانی ہوتی ہے؛ وقت گزر جاتا ہے؛ ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔

(۳) جب کسی فقرہ میں کچھ تفصیل ہو، تو اس کے اجزا علامت سکون سے الگ کرنے چاہئیں۔

مثال-حکیموں کا قول ہے کہ نیچر کے بے انتہا کام ہیں؛ اس کا خزانہ معمور ہے؛ علم ہمیشہ ترقی پر ہے؛ آیندہ نسل کے لوگ ایسی باتیں دریافت کریں گے، جو ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں۔

(علامات قرأت، ص:۱۳، ۱۸، ۱۹)

عبدالحق (۱۹۲۶ء)

وقفہ، (؛) جب سکتے سے زیادہ ٹھہراؤ کی ضرورت پڑے تو وقفہ استعمال کرتے ہیں، اس کا استعمال حسب ذیل موقعوں پر ہوتا ہے:

(۱) جملوں کے لمبے لمبے اجزا کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کے لیے (یہاں سکتوں کے علاوہ وقفوں کا استعمال اس وجہ سے ضروری ہے کہ خلط مبحث نہ ہو جائے) جیسے:

حق یہ ہے کہ اس زمانے میں، جب کہ قومی تپش نما کا پارا ہر گھڑی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے؛ جب کہ باوجود تعلیمی کاموں کی کثرت کے، قومی تعلیم کا کوئی صحیح خاکہ ہمارے سامنے نہیں ہے؛ جب کہ سیاسی تار و پود سارے ملک میں پھیلا ہوا ہے، مگر کوئی طریقہ قومی فلاح کا ایسا نہیں ہے، جس پر تمام جماعتیں متفق ہو سکیں؛ جبکہ مصلحت اور اصول، چال اور صداقت، تلون اور استقامت میں اکثر مغالطہ ہو جاتا ہے؛ جب کہ باوجود سادگی کے عیش پرستی کے بہت سے چور دروازے کھلے ہوئے ہیں؛ جبکہ باوجود ایثار اور قربانی کے دعوؤں کے حقیقی ایثار نفس اور ضبطِ نفس بہت کم نظر آتا ہے۔نواب وقارالملک کی سیرت ایک بڑی نعمت ہے۔

(۲) جہاں جملوں کے مختلف اجزا پر زیادہ تاکید دینا مدنظر ہوتا ہے، وہاں بھی وقفہ

استعمال ہوتا ہے۔

(الف) جو کرے گا، سو پائے گا؛ جو بوئے گا، سو کاٹے گا۔

(ب)   آنا، تو خفا آنا؛ جانا، تو رُلا جانا

آنا ہے تو کیا آنا؛ جانا ہے، تو کیا جانا

(ج) تم روئے ہمارا دل بے چین ہوا، تمہاری اُنگلی دکھی، تو ہمارے دل پر چوٹ لگی۔ مصیبتیں ہم نے بھریں، تکلیفیں ہم نے اٹھائیں؛ راتوں کو اٹھ اٹھ کر ہم بیٹھے، کندھے سے کندھا لگایا؛ چمکارا، لوریاں سنائیں، غرض کہ جان، مال، آرام سب کچھ تمہارے لیے تج دیا؛ کیا اس کا یہی صلہ ہے؟

(۳) جن جملوں کے بڑے بڑے اجزا کے درمیان ورنہ، اس لیے، لہٰذا، اگر چہ، چہ جائے کہ، دراں حالیکہ، لیکن اور اسی قسم کے ربط دینے والے الفاظ آئیں؛ وہاں ذہن کو سمجھنے کا موقع دینے کے لیے ان لفظوں سے پہلے وقفے کی علامت لگاتے ہیں۔ واضح رہے کہ جب مذکورۂ بالا الفاظ چھوٹے چھوٹے جملوں کو ملاتے ہوں تو یہ علامت نہ لگائی جائے گی بلکہ سکتہ ہی کافی ہوگا۔

(الف) اگر چہ آج کل نقادانِ فن اس بات کو مذموم سمجھتے ہیں کہ کسی خاص غرض کو پیش نظر رکھ کر، یا کسی خیال یا رائے کی اشاعت کے لیے کوئی ڈرامہ لکھا جائے؛ لیکن ہندوستان جیسے ملک میں، جہاں زندگی کا ہر پہلو قابلِ اصلاح ہے، اور معاشرت کے ہر شعبے میں تذبذب اور انتشار بپا ہے، فن کی بعض نازک اور خیالی خوبیوں کو قربان کر سکتے ہیں؛ بشرطیکہ وہ سلیقے سے لکھا جائے۔

(ب) چونکہ نکاح سے قبل ہی نسبت توڑ دی گئی، اور لڑکی چچا سے علیحدہ کر لی گئی؛ اس لیے ایسی شادی سے جو مذموم اور دردناک نتائج پیدا ہوتے ہیں، ان کا موقع ہی نہیں آیا۔

(۴) جن صورتوں میں سکتہ لاتے ہیں ان میں صرف ایسی حالت میں لائیں گے

جب جملے کے بعض ایسے حصوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا پڑے جن میں اندرونی طور پر سکتہ موجود ہے:

(ا) حیدر آباد، میسور اور تراونکوڑ، جنوبی ہند کی؛ بھوپال، گوالیار اور اندور؛ وسط ہند کی بڑی ریاستیں ہیں۔

(ب) حالی کی مسدس، یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید؛ نذیر احمد کی مراۃ العروس، توبۃ النصوح، محصنات، ایامیٰ؛ شبلی کی الفاروق، موازنہ، سیرت النبی؛ پڑھنے اور بار بار پڑھنے کے قابل ہیں۔

(قواعدِ اردو، ص: ۲۴۱، ۲۴۲)

عرضِ مرتب (دسمبر ۲۰۲۳ء):

مولوی عبدالحق نے وقفہ (؛) یعنی سیمی کولن (جسے اردو کے بیشتر مصنفین نے یا تو غیر ضروری یا اختیاری کے زمرے میں رکھا ہے) کے بارے میں شق نمبر ۳ کے تحت جو کچھ لکھا ہے، اس سے بعض لوگوں کو اتفاق نہیں۔ اگر اس پر عمل درآمد کیا جائے تو بہت سارے حروفِ عطف و دیگر اس شق کے تحت استعمال میں لائے جا سکتے ہیں۔ ایسے لفظوں کا الف بائی اشاریہ حسب ذیل ہے:

آخر کار، چونکہ، چہ جائے کہ، البتہ، باوجودیکہ، بلکہ، تاکہ، تاوقتیکہ، جبکہ، چنانچہ، چونکہ، چہ جائے کہ، حالانکہ، دراں حالیکہ، کیونکہ، لیکن، لہٰذا، ورنہ۔

رشید حسن خاں نے اپنی تحریروں میں ان حروف عطف سے پہلے وقفہ کا استعمال کیا ہے۔ خاکسار نے بھی اس مقالے میں ایسے تمام مقامات پر وقفہ کا نشان لگایا ہے۔ منشی غلام محمد نے ''رسالہ نجوم العلامات'' میں ان حروف کے بعد سکتہ لگانے کی سفارش کی تھی (ص ۱۹) لیکن یہ رواج میں نہیں آسکی۔

محمد اقبال سلمان (۱۹۵۹ء)

وقفِ ناقص (؛) کا اہتمام اردو تحریروں میں شاذ ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ سرِ دست یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ علامت ہمارے ہاں رواج پا چکے [سکے] گی یا نہیں؛ تاہم اسے حسب ذیل موقعوں پر استعمال کرنا ممکن ہے:

(ا) عام اصول تو یہ ہونا چاہیے کہ وقفِ ناقص ایسے جملوں کو علاحدہ کرنے کے لیے استعمال کیا جائے جن کا باہمی علاقہ اس تعلق کے معاملے میں کمزور ہو، جسے ظاہر کرنے کے لیے وقف کی علامت لگانی پڑے؛ جیسے:

شہروں میں ہمارا دم گھٹتا ہے؛ دیہات میں ہم کھلی فضا میں سانس لیتے ہیں۔

وقف اگر ایک سلسلے کے الفاظ یا چھوٹے چھوٹے اجزا کو الگ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، تو وقفِ ناقص سلسلہ وار جملوں کو، جو اپنی اپنی جگہ پورا مفہوم ادا کرتے ہوں، الگ الگ کرنے کے لیے استعمال ہونا چاہیے؛ جیسے:

اکثر آدمی تو اکثریت کے خیالات قبول کرتے ہیں؛ بعض بلند پایہ رہنماؤں کی پیروی کرتے ہیں؛ لیکن ایسے بہت ہی کم ہیں، جو اپنے طور پر سوچنے کے عادی ہوں۔

(رموزِ اوقاف، مشمولہ صحیفہ، لاہور، شمارہ: ۱۲، ۱۹۵۹ء)

غلام مصطفیٰ خاں (۱۹۷۳ء)

وقفہ. یہ علامت، سکتہ سے زیادہ ٹھہراؤ ظاہر کرتی ہے۔ اس کا استعمال ابھی تک عام تحریروں میں تو کیا، اہتمام سے چھپی ہوئی کتابوں میں بھی کم ملتا ہے۔ لوگ وقفہ کی جگہ بھی عموماً سکتے ہی سے کام چلاتے ہیں؛ حالانکہ خلطِ مبحث سے بچنے کے لیے وقفے کے مقام پر وقفے کا استعمال ضروری ہے...... ایک اور محل استعمال یہ بھی ہے کہ مثالیں پیش کرتے وقت الفاظ ''جیسے، مثلاً'' سے پہلے وقفہ لاتے ہیں۔ (جامع القواعد، ص: ۲۰۶)

گیان چند (۱۹۹۰ء)

اردو میں اس کا کاما بھی الٹ دیا گیا ہے۔ انگریزی میں اس کا استعمال کم ہے، اردو میں اور بھی شاذ۔ یہ ایسے دو آزاد اور مکمل جملوں کے درمیان لگایا جاتا ہے جن کے بیچ کوئی حرفِ ربط نہیں آیا؛ لیکن مصنف ان کو ایک دوسرے سے منسلک دکھانا چاہتا ہے۔ میری رائے میں اردو میں یہ قطعاً غیر ضروری ہے۔ اس کی جگہ فل اسٹاپ والی ڈیش یا کاما سے کام چل سکتا ہے۔ اس کا استعمال مالک رام اور رشید حسن خاں کے یہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ رشید حسن خاں 'اردو املا' میں اس کے استعمال کا یہ محل بھی متعین کرتے ہیں۔ ''جن جملوں کے بڑے بڑے اجزا کے درمیان ورنہ، اس لیے، لہٰذا، اگر چہ، چہ جائے کہ، دراں حالیکہ، لیکن اور اس قسم کے ربط دینے والے الفاظ آئیں؛ وہاں ذہن کو سمجھنے کا موقع دینے کے لیے ان لفظوں سے پہلے وقفے کی علامت لگاتے ہیں۔''

(اردو املا، ص:۵۵۳)

انھوں نے جو مثالیں دی ہیں ان میں 'لیکن' اور 'اس لیے' سے قبل سیمی کولن لگایا ہے۔ میری رائے میں ان الفاظ سے پہلے یا تو کوئی علاماتِ وقف ہونی ہی نہیں چاہیے یا کاما لگا دیا جائے۔ اس کے استعمال کی دو مثالیں یہ ہیں:

(ا) کوئی شخص ایک گھٹیا کام سے مادی فائدہ کتنا ہی اٹھالے، ادب کی شریعت میں اس کو قابلِ نفریں سمجھا جاتا ہے؛ اور یہ ہوا ہے۔

(رشید حسن خاں، ادبی تحقیق، ص:۱۰۷)

(ب) اسی صفحے سے نواب ضیاء الدین احمد خاں کی فارسی میں ''تقریظ'' کی ابتدا ہوتی ہے؛ یہ، صفحہ ۱۰۸ء پر ختم ہوئی ہے۔

(مالک رام، گفتارِ غالب، ص:۱۰۷)

ان میں پہلی مثال میں کاما اور دوسری میں ڈیش سے کام چل سکتا تھا۔

(تحقیق کا فن، ص: ۲۸۹، ۲۹۰)

عرض مرتب (دسمبر ۲۰۲۳ء):

گیان چند کو تسامح ہوا ہے۔ لہٰذا، اگر چہ، ورنہ وغیرہ وغیرہ حروف کے استعمال سے پیشتر وقفہ کے استعمال کی سفارش مولوی عبدالحق نے کی تھی، شق نمبر ۳ کے تحت، رشید حسن خان نے نہیں۔

رشید حسن خاں: (۱۹۹۴ء)

سیمی کولن [؛]۔ کاما چھوٹے ٹھہراؤ کو ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے۔ جب زیادہ ٹھہراؤ کا محل ہو تو وقفہ یعنی سیمی کولن [؛] لگانا چاہیے۔

(الف) جب کئی لفظوں یا ٹکڑوں کے درمیان کاما ہو، اس صورت میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آخری لفظ یا ٹکڑے کے بعد لمبے وقفے (ٹھہراؤ) کا محل معلوم ہوتا ہے؛ ایسے موقعوں پر آخری لفظ یا ٹکڑے کے بعد سیمی کولن لانا چاہیے؛ جیسے: سچائی، خلوص، ایمان داری؛ ان سب کی ضرورت ان کو نہیں۔ دہلی، بمبئی، مدراس؛ یہ سب شہر میرے دیکھے ہوئے ہیں۔ شبلی کی الفاروق، محمد حسین آزاد کی آبِ حیات، نذیر احمد کی ابن الوقت؛ یہ سب کتابیں پڑھنے کے قابل ہیں۔ حیدر آباد، میسور، ٹراونکور، جنوبی ہند کی؛ بھوپال، گوالیار اور اندور؛ وسطِ ہند کی ریاستیں تھیں۔ جو کرے گا، سو پائے گا؛ جو بوئے گا، سو کاٹے گا۔

(عبارت کیسے لکھیں، ص: ۳۰، ۳۱)

○

رابطہ Colon(:)

صہبائی (۱۸۴۵ء)

زوج ۳۳ کا بیان- جبکہ ایک عبارت کئی حصص میں منقسم ہو اور رہر حصہ بھی کئی حصوں میں تقسیم کیا جاوے تو پہلے حصوں میں امتیاز کے واسطے زوج لکھا جاتا ہے۔ مثلاً جب تم میرے گھر نہ آؤ گے: تاکہ کتابیں ہر علم کی جو ایک حجرہ میں مدت سے بند ہیں، علیحدہ کر دو تو: البتہ میں بھی جہاں تک ہو سکے گا، ایک لحہ کاروبارِ ضروری سے فارغ ہو کر، اس کام میں مصروف رہوں گا۔ اگر ایک حصہ سے تمام مضمون مفہوم ہو جاوے اور انتظار مالحق [مابعد] کا باقی نہ رہے اگر چہ وہ حصہ مفرد ہو؛ لیکن نشان زوج کا وہاں بھی لکھ سکتے ہیں۔ مثال یہ بحث دوم پر مشتمل ہے: قسم اول قواعدِ علمِ صرف، قسم دوم قواعدِ علمِ نحو۔

(رسالۂ صرف ونحوِ قواعدِ اردو، ص:۱۰)

سر سید (۱۸۷۴ء)

کولن یعنی علامتِ وقفہ۔

جہاں علامتِ سکتہ ہو، اس لفظ پر پڑھنے میں ذرا ٹھہرنا چاہیے اور جہاں علامتِ سکون ہو وہاں ذرا اس سے زیادہ اور جہاں علامت وقفہ ہو؛ وہاں ذرا اس سے بھی زیادہ۔

اس علامت سے فقرہ کو دو یا زیادہ حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جو حصے علامت سکون [سیمی کولن] سے علیحدہ کیے جاتے ہیں، بہ نسبت ان کے، ان حصوں میں جو علامتِ وقفہ [کولن] سے علاحدہ ہوتے ہیں، اور بھی کم مناسبت ہوتی ہے، مگر ایسی بھی نہیں ہوتی کہ ان پر مطلب ختم ہو گیا ہو۔

(۱) جب کوئی جز، فقرہ کا اپنی ترکیب اور معنی بتانے میں پورا ہو، مگر اس کے بعد کا جملہ بیانیہ ہو، تو ایسی جگہ علامتِ وقفہ لگانی چاہیے۔

مثال-غور کرنے کی عادت ڈالو: کہ اس سے زیادہ عمدہ کوئی تعلیم نہیں۔

(۲) جب کہ ایک فقرہ کے کئی جملے علامت سکون سے [سیمی کولن] علیحدہ کیے جادیں، اور ان کا نتیجہ اخیر فقرہ یا فقروں پر منحصر ہو، تو اخیر فقرے سے پہلے علامتِ وقفہ لگانی چاہیے۔

مثال- نیکی سے خدا خوش ہوتا ہے، برے کاموں سے خدا ناراض ہوتا ہے؛ نیکوں کو عاقبت میں جزا دے گا، بدکاروں کو قیامت کے دن سزا دے گا: یہ ایسے خیالات ہیں کہ دنیا کو خوف و رجا میں رکھتے ہیں، نیکی پر رغبت دلاتے ہیں، گناہوں سے باز رکھتے ہیں۔

(علاماتِ قرات، ص: ۱۳، ۱۹، ۲۰)

عبدالحق (۱۹۲۶ء)

رابطہ (:): اس کا ٹھہراؤ وقفے کے ٹھہراؤ سے زیادہ ہوتا ہے۔

(۱) عام طور پر اس کا استعمال وہاں کیا جاتا ہے جہاں جملے کے کسی سابقہ خیال یا بات کی تشریح یا تصدیق کی جاتی ہے؛ جیسے:

(۱) سفر ہو یا حضر، دن ہو یا رات، کام ہو یا تفریح؛ ہمیشہ اور ہر جگہ اپنی صحت کا خیال رکھو: اگر کوئی نعمت ہے تو یہی ہے۔

(ب) کیا خوب سودا نقد ہے: اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے۔

(ج) یہ خاموشی کہاں تک؟ لذتِ فریاد پیدا کر،
زمیں پر تو ہو، اور تیری صدا ہو، آسمانوں میں:
یہی آئینِ قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے:
جو ہے راہِ عمل میں گامزن، محبوبِ فطرت ہے

(د) کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ:
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

(ہ) کسی کلیّے کے رسالے کے لیے یہی کافی نہیں ہے کہ وہ متفرق اور مختلف معلومات کی ایک کھتونی ہو، اس کا بڑا لوازمہ تحریکی قوت ہے۔ ذوقِ جستجو کو اشتعال دینا، جودتِ طبع کو اکسانا: یہی اس کا مہا کاج ہے؛ اس کی کامیابی کی جانچ اسی کسوٹی پر ہوتی ہے۔

(و) انسان کو بعضے کاموں کی قدرت ہے، بعضوں کی نہیں: وہ چل سکتا ہے، دوڑ سکتا ہے؛ مگر اُڑ نہیں سکتا۔

(۲) جب کسی مختصر مقولے یا کہاوت وغیرہ کو بیان کرنا ہو تو تمہیدی جملے اور اصل جملے کے بیچ میں نیم وقفہ یا رابطہ لاتے ہیں۔

(ا) کسی حکیم کا قول ہے: آپ کاج مہا کاج۔

(ب) بقول شاعر: عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے۔

(ج) سچ ہے: گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔

(۳) ایسے دو جملوں کے بیچ میں رابطہ لاتے ہیں جو آپس میں متقابل یا ایک دوسرے کی ضد ہوں؛ اور دونوں مل کر ایک پورے خیال کو ظاہر کریں۔ من چلتا ہے: ٹٹو نہیں چلتا۔

(۴) جب دو جملوں میں سے ایک دوسرے کی توجیہ کرے، مگر کوئی حرفِ

توجیہ۳۴؎ ان کے بیچ میں نہ ہو: ان کے درمیان میں رابطہ لاتے ہیں؛ جیسے: بچوں کو تنہائی میں نصیحت کرنا چاہیے: سب کے سامنے نصیحت کرنے کا اثر الٹا ہوتا ہے۔

(قواعدِ اردو، ص: ۲۴۲، ۲۴۳)

غلام رسول: (۱۹۶۰ء)

رابطہ حسبِ ذیل موقعوں پر استعمال کیا جاتا ہے:

(۱) کسی مثال، کہاوت، قول، اقتباس اور کچی بات سے پہلے؛ مثلاً:

حیدرآباد: آندھرا پردیش کا صدر مقام ہے۔

(۲) مثل مشہور ہے: جان بچی لاکھوں پائے۔

(۳) قرآن کہتا ہے: خدا ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔

(۴) ایک اردو روسی پروفیسر کی تقریر کا نچوڑ یہ ہے:......

سچ ہے: گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔

(۲) کسی عبارت کے خلاصے کے طور پر؛ مثلاً:

سیتا جی کی کہانی کا خلاصہ:......

(اردو املا، ص: ۵۱، ۵۲)

گیان چند جین (۱۹۹۰ء)

کولن (:) سرسید نے اس کا ترجمہ 'وقفہ' کیا جب کہ مولوی عبدالحق نے سیمی کولن کو وقفہ کہا اور کولن کو 'رابطہ'۔ سرسید کے مطابق فل اسٹاپ سے زیادہ ٹھہراؤ سیمی کولن میں، اور سیمی کولن سے زیادہ کولن میں ہوتا ہے۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ سب سے زیادہ ٹھہراؤ فل اسٹاپ ہی میں ہوتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے بھی اس کا ٹھہراؤ سیمی کولن سے زیادہ مانا ہے۔ ان کے مطابق اس کا استعمال جملے کے سابقہ خیال یا بات کی تشریح یا تصدیق

کے لیے کیا جاتا ہے۔ وہ اس کے استعمال کی جو مثالیں دیتے ہیں وہ کم از کم موجودہ استعمال نیز انگریزی استعمال کے منافی ہیں مثلاً یہ مثالیں:

(۱) سفر ہو یا حضر، دن ہو یا رات، کام ہو یا تفریح ہمیشہ اور ہر جگہ اپنی صحت کا خیال رکھو: اگر کوئی نعمت ہے تو یہی ہے۔

(۲)

یہ خاموشی کہاں تک؟ لذتِ فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو، اور تیری صدا ہو آسمانوں میں:

(۳)

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ:
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

رشید حسن خاں نے اس کے استعمال کو بہتر طریقے سے بیان کیا ہے۔

(اردو املا، ص: ۴۹-۵۴۸)

اردو میں اس کا استعمال ذیل کے موقعوں پر کیا جاتا ہے۔

(۱) اقتباس دینے سے پہلے تعارفی جملے کے آخر میں۔ انگریزی میں یہاں کولن اور ڈیش مستعمل ہے۔ اردو میں محض کولن سے کام چلا لیا جاتا ہے، مثلاً ارسطو کا قول ہے: انسان تعقل پسند حیوان ہے۔

(۲) کسی مصنف کے نام کے بعد کولن لگا کر اس کی تصنیف کا ذکر کرنا ہو؛ مثلاً:
رشید حسن خاں: ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ

(۳) یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ متعاقب عبارت، ماسبق بات کی صراحت، تشریح یا تفصیل ہے؛ مثلاً:

(۱) غزلیات کی ردیف وار تفصیل حسبِ ذیل ہے:
الف: ۵۲ شعر.....الخ

ب-اتر پردیش کے لوک گیت: ایک تخلیقی تحقیق
ج-تحقیق دو قسم کے ہوتی ہے: تعمیری اور تخریبی

(تحقیق کا فن، ص: ۲۸۷-۲۸۹)

عرضِ مرتب (دسمبر ۲۰۲۳ء)

ڈاکٹر گیان چند نے لکھا ہے کہ ''سرسید کے مطابق فل اسٹاپ سے زیادہ ٹھہراؤ، سیمی کولن'' میں ہوتا ہے۔ سرسید نے یہ کہیں نہیں لکھا۔ گیان چند کو تسامح ہوا ہے؛ البتہ مولوی عبدالحق کی جن مثالوں پر اعتراض وارد کیا ہے، میری دانست میں اردو کے تعلق سے وہ اعتراض درست ہے۔ انجمن کی مطبوعہ قواعدِ اردو کے جو نسخے مارکیٹ میں دستیاب ہیں ان مثالوں میں ان پر کولن کا استعمال بھی نظر نہیں آتا۔ قاری کو یہ طے کرنا مشکل ہے کہ مولوی صاحب نے کس مقام پر کولن کا استعمال کیا ہے۔ خاکسار نے قواعدِ اردو کے طبع دوم ۱۹۲۶ء اور ایک پاکستانی نسخے مطبوعہ ۲۰۱۷ء سے یہ خالی مقامات جو علامتِ رابطہ سے خالی تھے پُر کیے۔

کولن کا جس طور اردو میں استعمال ہے اس کا اردو نام رابطہ اس مفہوم سے پوری طرح مطابقت نہیں رکھتا۔ رشید حسن خاں نے فسانۂ عجائب (مطبوعہ دہلی ۱۹۹۰ء) میں کولن کے لیے لفظ 'بیانیہ' کا استعمال کیا ہے۔ (مقدمہ ص ۱۰۶) میں سمجھتا ہوں کہ یہ نام اس کے مفہوم پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ اگر رواج میں آجائے تو کچھ ہرج بھی نہیں۔ پروفیسر نعیم الرحمٰن الہ آبادی نے اس کو 'شارحہ' نام دیا تھا، یہ بھی اس پر منطبق ہوتا ہے۔

رشید حسن خاں (۱۹۹۴ء)

رابطہ، کولن (:)
کسی کا قول نقل کیا جائے، کسی اقتباس کو لکھا جائے، نظم یا نثر کی تشریح کی جائے،

کسی کا مصرع یا شعر نقل کیا جائے، الفاظ کے معنی لکھے جائیں، ایسے موقعوں پر اس علامت کو استعمال کیا جاتا ہے؛ جیسے: ہندوستان کے مشہور شاعر یہ ہیں: میر، غالب، اقبال، انیس، نظیرا کبرآبادی۔ مومن کا یہ شعر:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مجھے اب تک یاد ہے۔ غالب نے ایک خط میں لکھا ہے: مغل کے لہجے کی نقل نہ کرو۔

دزد: چور — اسراف: فضول خرچی

(عبارت کیسے لکھیں، ص:۳۱)

عرض مرتب (دسمبر ۲۰۲۳ء):

انگریزی میں رابطہ یعنی کولن کا استعمال وقت کے اندراج کے لیے بھی کیا جاتا ہے؛ جیسے:

3:15 12:30 6:10 9:20 وغیرہ

اردو میں بھی وقت کا اندراج اسی طرح ہوگا:

۳:۱۵ ۱۲:۳۰ ۶:۱۰ ۹:۲۰ وغیرہ

اوقاف کی تعریف وتشریح کرنے والوں نے اردو میں اس کے استعمال کا تذکرہ نہیں کیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ اردو میں عموماً وقت کا اندراج اعداد میں نہیں لفظوں میں کیا جاتا ہے؛ جیسے: تین بج کر پندرہ منٹ، شب بارہ بج کر دس منٹ وغیرہ۔ یا پونے، سوا اور ساڑھے کے سابقے کے ساتھ، جیسے: سوا سات، ساڑھے آٹھ، پونے دس وغیرہ۔ اس پر حسب ضرورت صبح، دوپہر، شام اور رات کا اضافہ بھی کرلیا جاتا ہے۔ میں نے 'تذکرۂ ماہ وسال' از مالک رام (دلی، ۱۹۹۱ء) دیکھا۔ اس میں جہاں کہیں بھی

ولادت ووفات کے وقت کا اندراج ہے، وہ لفظوں میں ہے اعداد میں نہیں۔ اس طور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں وقت کا اندراج اعداد میں کرنے کا رواج نہیں۔ مستقبل میں اگر وقت کا اندراج اعداد میں کرنا ممکن ہوا تو اس کے اندراج کی صورت شاید یہ ہوگی:

- پروفیسر عبدالقادر سروری نے ۱۱؍مارچ ۱۹۷۱ء کو (شب کے ۱۰:۳۰ پر) جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔
- نظامی بدایونی نے ۸؍جون ۱۹۴۷ء کو (رات ۱۲:۳۰ پر) اس دارِفانی سے کوچ کیا۔

آج کل مساجد میں اوقاتِ صلوٰۃ کے اردو چارٹ اور سحر وافطار کی جو جنتریاں نظر آتی ہیں، ان میں وقت کا اندراج انگریزی اعداد اور کولن کے استعمال کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ اردو میں وقت کے اندراج کے ساتھ کولن کے استعمال کا نقطۂ آغاز ہے۔

○

سوالیہ/استفہام Note of (؟)Interrogation

صہبائی (۱۸۴۵ء)

(۹) علامت ۔'استفہام' کی ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جملے میں کسی امر سے استفہام کیا گیا ہے۔ اور معلوم کیا چاہیے کہ استفہام تین طرح پر ہے: استخباری، اقراری اور انکاری۔ استفہامِ استخباری وہ ہے کہ اُس سے فقط پوچھنا اور سمجھنا ایک امر کا مطلوب ہو؛ جیسے: کہاں جاتے ہو؟ جبکہ مخاطب کے جانے کے مقام سے سوال کیا جائے۔

اور اقراری وہ ہے کہ اُس سے اثبات ایک امر کا مطلوب ہو؛ مثلاً: تم وہاں نہیں گئے تھے؟ یعنی مقرر [یقیناً] گئے تھے۔

اور انکاری وہ ہے کہ اس سے نفی ایک امر کی مطلوب ہو؛ مثلاً: تم وہاں جاسکتے ہو؟ یعنی نہیں جاسکتے یا وہاں کون جاسکتا ہے یعنی کوئی نہیں جاسکتا۔ پس اس صورت میں اگر اُس علامت کے ساتھ کوئی اور علامت زیادہ کی جاتی تو امتیاز ہر قسمِ استفہام کی بہ خوبی ہو جاتی؛ علی الخصوص جس وقت کسی ایک عبارت میں 'استخباری'، اور 'اقراری'، یا

'استخباری' اور 'انکاری' دونوں کا اقبال [اقرار] ہوسکتا ہو۔ مثلاً: تم کہاں جاؤ گے؟ یا تم وہاں نہیں گئے تھے؟ اول میں استخباری اور اقراری، اور دوسرے میں استخباری اور انکاری دونوں کا احتمال ہے؛ پس علامتِ خاص سے مطلبِ خاص بہ خوبی سمجھ میں آ جاتا؛ لیکن چونکہ ہر قسمِ استفہام کے واسطے انگریزی میں وہی ایک علامت ہے؛ لہٰذا مطابقت کے واسطے یہاں بھی اُسی علامت کو برقرار رکھ کر ہر قسمِ استفہام کی امتیاز کے واسطے قرینۂ مقام پر کفایت کی۔ مثلاً جس وقت کہا جاوے: تم کہاں جاؤ گے؟ پس اگر مقامِ مقتضی، استخبار کا ہے، یہ استفہام استخباری ہے اور اگر مقتضی، نفی کا ہے، انکاری ہے اور اسی قیاس سے امتیاز، استخباری اور اقراری کی۔

(رسالۂ صرف ونحوِ قواعدِ اردو، ص: ۱۰، ۱۱)

سر سید (۱۸۷۴ء)

علامتِ استفہام یا سوال: یہ علامت ایسے فقرے کے اخیر میں لگائی جاتی ہے جس میں کوئی بات پوچھی گئی ہو، مثال:

تم اپنے کام سے کیوں غفلت کرتے ہو؟
آپ کا مزاج کس طرح ہے؟
کیا ہم نے تم سے نہیں کہا تھا؟

(علاماتِ قرأت، ص ۲۱)

عبدالحق (۱۹۲۶ء)

سوالیہ: سوالیہ جملے کے آخر میں یہ علامت لگائی جاتی ہے:

کیا ہے:
کس کی باری ہے؟

کیا یہ ممکن ہے، کہ آپ مجھ سے کل صبح باغِ عامہ میں ملاقات کریں؟

(قواعدِ اردو، ص: ۲۴۶، ۲۴۷)

غلام رسول (۱۹۶۰ء)

سوالیہ [؟] کسی سوال کے آخر میں استعمال کیا جاتا ہے؛ مثلاً:

تم کیا کرتے ہو؟

وہ کل کیوں نہیں آیا؟

(اردو املا، ص ۵۳)

رشید حسن خاں (۱۹۷۴ء)

سوالیہ: اس علامت کا ایک محلِّ استعمال یہ بھی ہے کہ جب کسی لفظ یا جملے یا شعر کو بہ لحاظِ صحت، مشکوک سمجھا جاتا ہے تو اس کے بعد قوسین میں اس علامت کو لکھ دیتے ہیں، تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ اس مقام پر کوئی خرابی ہے۔ تدوین میں اس کا یہ استعمال عام ہے۔ اس کے بغیر یہ سمجھا جائے گا کہ مدوّن کو اس محلِ نظر مقام کی اطلاع نہیں تھی اور یہ بڑا الزام ہوتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ ایسے مقامات پر اس علامتِ استفہام کو لازماً قوسین کے اندر لکھا جائے گا، یعنی (؟) اگر قوسین کے بغیر لکھا جائے گا تو پھر وہ سادہ علامتِ استفہام ہوگی، اور اس سے یہ تصور حاصل نہیں ہوگا۔

(اردو املا، ص: ۵۵۶، ۵۵۷)

اسے ''نشانِ استفہام'' بھی کہتے ہیں۔ یہ علامت لفظ یا جملے کے آخر میں آتی ہے، اس طرح:

وہ آیا تھا؟

کون آیا تھا؟

کیا بات ہے؟

(عبارت کیسے لکھیں، ص ۱۳۲)

گیان چند (۱۹۹۰ء)

علامتِ استفہام: انگریزی کے برعکس اردو میں دائیں طرف سے لکھی جاتی ہے۔ سوالیہ نشان کا منھ [جملے] کے خاتمے کی طرف کھلنا چاہیے۔ انگریزی میں اس کا منہ بائیں طرف کو اور اردو میں اس کے برعکس دائیں طرف کو کھولا جاتا ہے۔

رشید حسن خاں نے اس کا یہ اہم محل استعمال بھی لکھا ہے کہ کسی لفظ یا جملے یا شعر کی صحت مشکوک ہو تو اسے قوسین کے اندر لکھ دیا جاتا ہے، اس طرح (؟) قوسین کا ہونا لازمی ہے۔ (اردو املا، ص: ۵۵۷)

(تحقیق کا فن، ص: ۲۹۰)

عرضِ مرتب (دسمبر ۲۰۲۳ء):

سوالیہ یا علامتِ استفہام پر صہبائی کے سوا کسی نے بحث نہیں کی، جو مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ بھی سامنے کی ہیں۔ دراصل اس امر کی وضاحت ضروری تھی کہ اردو کے سوالیہ کلمات (جنھیں انگریزی کے Wh-questions کی طرز پر 'کافِ سوالیہ' کہہ سکتے ہیں) کیا، کون، کب (کب تک) کیوں (کیوں کے، کیوں کر بمعنی کس طرح، کیسے۔ کیونکہ علیٰحدہ لفظ ہے، جو حروف عطف میں شامل ہے) کہاں (کہاں تک) کدھر، کس (کس کو، کس کی، کس کے، کس لیے) کیسا (کیسے، کیسی)، کتنا (کتنے، کتنی) اور کاہے سے بننے والے جملے اور شعروں میں لازماً اس علامت کا استعمال کیا جائے گا۔ ان میں کافِ سوالیہ کے علاوہ ایک لفظ اور ہے جو سوالیہ کے زمرے میں آتا ہے: آیا (بمعنی بتاؤ تو۔کلمۂ استفہام) نثر و نظم میں ان کی بالترتیب مثالیں حسب ذیل ہیں:

کیا— کیا آپ ناول کے فن سے واقف ہیں؟

ع-کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟

کون — یہاں کون، کس کا ہے؟

ع-کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کہاں کا ہوں؟ بتاؤں کیسے؟

کب — آپ کب تک یہاں قیام کریں گے؟

ع-کب سے ہوں؟ کیا بتاؤں؟ جہانِ خراب میں

کیوں— آپ مجھ سے ناراض کیوں ہیں؟

ع-کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل؟

کہاں — کہاں جانے کی تیاریاں ہیں؟

ع-کہاں کہاں؟ ترا عاشق تجھے پکار آیا

کدھر— آپ کدھر ٹھہرنا پسند کریں گے؟

ع-کدھر کا قصد کروں اور کدھر کو جاؤں میں؟

کس — کس نے کتنے نمبر حاصل کیے؟

ع-ہم کہاں کے دانا تھے؟ کس ہنر میں یکتا تھے؟

کیسے — آپ کے مزاج کیسے ہیں؟

ع-زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے؟

کتنے — آپ کی جیب میں کتنے روپے ہیں؟

ع-کتنے حیران ہوئے؟ کتنے پشیمان ہوئے؟

کاہے— آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔کاہے؟استفہام انکاری

ع-کاہے کو میر کوئی دبے جب بگڑ گئی؟

کیوں کے— جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کے ہو رشک فارسی؟

گفتہ غالب ایک بار، پڑھ کے اسے سنا کہ یوں غالب

آیا— آیا آپ میری بات کا جواب دیں گے؟

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ جس جملے یا مصرع میں تین چار ’کاف سوالیہ‘ یک جا ہو گئے ہوں تو علامتِ استفہام ہر ایک پر لگائی جائے یا جملے و مصرعے کے اختتام پر؛ جیسے:

کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کہاں کا ہوں؟ بتاؤں کیسے
اپنے حالات کو تحریر میں لاؤں کیسے

راقم الحروف کا خیال ہے کہ ہر جگہ علامت لگانے کے بجائے مصرع کے اختتام پر علامت کا لگا دینا مناسب ہوگا، اس طرح:

ع- کون ہوں، کیا ہوں، کہاں کا ہوں، بتاؤں کیسے؟
ع- کب سے ہوں، کیا بتاؤں، جہانِ خراب میں؟

دقت وہاں آتی ہے جہاں سوالیہ کلمہ موجود نہ ہو اور جملہ یا عبارت سوال قائم کرتی نظر آئے؛ جیسے:

تم وہاں نہیں گئے تھے؟ یعنی کیا تم وہاں نہیں گئے تھے۔

اسی طرح:

تم وہاں جا سکتے ہو؟ اس میں بھی ’کیا‘ محذوف ہے، مطلب یہ ہے کہ کیا تم وہاں جا سکتے ہو؟

اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ گفتگو میں لہجہ اور آواز کا زیر و بم جملے میں استفہام پیدا کر دیتا ہے؛ لیکن تحریر میں اگر اس پر علامت نہ لگائی جائے تو لکھنے والے کا عندیہ واضح طور پر ظاہر نہیں ہو سکے گا۔

بعض جملوں میں کاف سوالیہ نہیں ہوتا پھر بھی وہ سوالیہ ہوتے ہیں؛ جیسے:

’گھر‘ میں دو چشمی ھ لکھی جائے یا کہنی دار؟

دنیا کی کَل علم سے چلتی ہے یا عمل سے؟

دونوں جملوں میں ’یا‘ ندائیہ ہے، لیکن یہاں یہ سوال قائم کر رہا ہے۔

عموماً ''کاف سوالیہ'' پر سوالیہ علامت لگائی جائے گی؛ لیکن جملے کے سیاق وسباق پر نظر کیے بغیر نشان استفہام لگا دینا درست نہیں ہوگا۔ مثلاً یہ جملے:

کیا بوڑھا کیا جوان! سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

کیا وہ کیا تم! دونوں ایک ہو۔

بچے کیا جوان کیا! سب کی حالت خراب ہے۔

○

فجائیہ ۳۵/ ندائیہ

(!)Note of Exclamation

صہبائی (۱۸۴۵ء)

یہ علامت اکس کلمیشن یعنی 'فاصلہ' کی ہے۔ اس سے تعجب یا تہدید یا تحقیر یا اظہارِ رنجِ طبیعت یا مستعد کرنا کسی امر پر معلوم ہوتا ہے؛ مثلاً:

وہ کیا خوبصورت ہے!

کیا کرتا ہے! یا خبردار! شرم کی بات ہے! حیف ہے! دلیر ہو!

(رسالۂ صرف ونحوِ قواعدِ اردو، ص: ۱۱)

سرسید (۱۸۷۴ء)

علامتِ تعجب: جب کہ فقرے میں کوئی ایسا کلمہ جس سے دفعتاً جوش، یا مسرت، یا خوف، یا تعجب وغیرہ پیدا ہوتا ہو، تو اس کے اخیر میں یہ علامت لگائی جاتی ہے؛ مثال:

او ازلی و ابدی خدا!

او خوش کرنے والے اور خوف دلانے والے خیال!

میں نے شیخ کلّو سے پوچھا کہ تم کون ہو، اس نے کہا کہ گیدڑ!!

(علاماتِ قرأت، ص۲۲)

عبدالحق (۱۹۲۶ء)

فجائیہ: یہ اُن الفاظ یا جملوں کے بعد لگائی جاتی ہے جن سے کوئی جذبہ ظاہر ہوتا ہے؛ جیسے: غصہ، حقارت، استعجاب، خوف وغیرہ۔ جذبے کی شدت کی مناسبت سے ایک سے زیادہ علامتیں بھی لگا دیتے ہیں:

اُفوہ! سخت تکلیف ہے۔

معاذ اللہ! بس صاحب! بس!!

وہ اور رحم! اس کی امید فضول ہے۔

[ع] میں، اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں!

(قواعدِ اردو، ص۲۴۶)

غلام رسول (۱۹۶۰ء)

فجائیہ: اُن لفظوں یا جملوں کے بعد استعمال کیا جاتا ہے جن سے کوئی جذبہ ظاہر ہوتا ہے؛ مثلاً:

اُفوہ! سخت تکلیف ہے۔

شاباش! خوب سبق یاد کیا ہے۔

چھی چھی! اسے ہاتھ نہ لگانا۔

ندائیہ: پکارنے، محبت، حقارت اور تعظیم کے اظہار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے؛ مثلاً:

او لڑکے!، اے خدا!، ابے احمق!، اجی حضور!

رشید حسن خاں (۱۹۷۳ء)

یہ علامت، منادی کے ساتھ بھی استعمال کی جاتی ہے اور اسی لیے اس کو 'ندائیہ' بھی کہتے ہیں؛ جیسے:

مومن! یہ لافِ الفتِ تقویٰ ہے کیوں، مگر
دلّی میں کوئی دشمن ایماں نہیں رہا

صنم! تری بھی ادا کا کوئی جواب نہیں

(اردو املا، ص:۵۵۶، ۵۵۷)

جب علامت، منادیٰ کے بعد آتی ہے تو اسے 'ندائیہ' بھی کہتے ہیں۔ حرف ندا کبھی عبارت میں ہوتا ہے؛ جیسے: اے دوست! خدایا!، کبھی عبارت میں نہیں ہوتا؛ جیسے: لڑکو! یہاں آؤ۔ حامد! تم کہاں جا رہے ہو۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب!

جب یہ علامت ان لفظوں یا جملوں کے بعد آتی ہے جن سے کوئی جذبہ؛ جیسے: غصہ، حقارت، نفرت، خوف، غم، تعجب ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے، تب اِسے 'فجائیہ' کہتے ہیں؛ جیسے:

افوہ! سخت تکلیف ہے۔ بس صاحب! بس!!۔ وہ اور مروت!، افسوس صد افسوس!

جن لفظوں سے تعریف ظاہر ہوتی ہے ان کے بعد بھی اسے لکھتے ہیں؛ جیسے:

واہ واہ!، سبحان اللہ!

(عبارت کیسے لکھیں، ص:۱۳۱، ۱۳۲)

گیان چند(۱۹۹۰ء)

فجائیہ یا ندائیہ: انگریزی میں یہ محض فجائیہ کے اظہار کے لیے آتا ہے، 'ایم ایل اے ہینڈ بک' میں ص: ۱۰ پر لکھا ہے کہ تحقیقی تحریروں میں اس کو نہایت شاذ استعمال کرنا چاہیے۔ اردو کی حد تک بھی یہ مناسب ہے گو تخلیقی متن کی تدوین میں اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے؛ مثلاً:

میں اور حظِ وصل! خدا ساز بات ہے۔

اردو میں اس کا بہتر استعمال 'ندائیہ' کے طور پر ہے۔ انگریزی میں یہ ندائیہ کے لیے مستعمل نہیں۔ اردو میں اسے منادی کے آگے بنا دیا جاتا ہے تو واضح ہو جاتا ہے کہ کسی کو پکارا گیا ہے؛ مثلاً: دلِ ناداں! تجھے ہوا کیا ہے

(تحقیق کا فن، ص ۲۹۰)

عرض مرتب (دسمبر ۲۰۲۳ء):

فجائیہ اور ندائیہ پر ہمارے بزرگوں نے بڑی اصولی مگر رسمی سی گفتگو کی ہے۔ سکتہ کی طرح اس کا دائرۂ استعمال بھی بہت وسیع ہے۔ عام طور پر یہ علامت تحسین و تبریک، غم و تأسف، تمنا، حیرت و تعجب، تخاطب و ندا اور نفریں و مذمت کے مواقع پر استعمال ہوتی ہے۔ ان مختلف اور متضاد کیفیتوں اور مواقع کے لیے اردو میں مستعمل کلمات ہیں۔ ان کلمات کے ساتھ تو یہ علامت لازمی لگائی جائے گی۔

اس علامت کا استعمال سب سے زیادہ فکشن میں دیکھا گیا ہے، ابن صفی (ف ۱۹۸۰ء) کی ناولوں میں ان کا بہ کثرت استعمال ہے، خصوصاً مکالموں میں۔ فکشن کے بعد شاعری میں بھی اس کے استعمال کی قابل ذکر گنجائش ہے۔ ادبی تحقیق میں اس کا استعمال شاذ ہی دیکھا گیا ہے۔ اس علامت سے اردو کے جو الفاظ متعلق معلوم ہوئے، وہ الف بائی ترتیب میں درج کیے جاتے ہیں:

آفریں، آہ، آہا، ابے، اجی، احسنتُ احسنتُ، اخ تھو، اخاہ، ارے، استغفر اللہ، اُف، افسوس، اُفوہ، اللہ اللہ، اللہ رے، اماں، انا للہ وانا الیہ راجعون، او، اوہو، اے جی، اے ہے، بس، بہت اچھا، بہت خوب، پھٹکار ہے، تعالی اللہ، تُف، توبہ توبہ، جزاک اللہ، چھی چھی، حاشا وکلا، حبّذا حبّذا، حسرتا، حیف، خوب، دُر، دریغا، ذرا، زنہار، سبحان اللہ، شاباش، صدافسوس، صلی علیٰ صلی علیٰ، عیاذاً باللہ، کاش، لاحول ولاقوۃ الا باللہ، لعنت، ماشاء اللہ، مرحبا مرحبا، معاذ اللہ، نعوذ باللہ، نوج، واحسرتا، وامصیبتا، واہ واہ، وائے، ہا، ہائے ہائے، ہزار لعنت، ہشت، ہے ہے، ہیہات ہیہات، یاالٰہی۔

مذکورہ بالا لفظوں میں سے کچھ تنہا استعمال ہوتے ہیں اور کچھ کسی دوسرے لفظ کے ساتھ مل کر آتے ہیں، جیسے: بس صاحب بس!، اولڑکے!؛ متعدد مثالیں گذشتہ سطور میں بھی گزر چکی ہیں۔

○

قوسین Parentheses, Bracket

( )

صہبائی (۱۸۴۵ء)

علامت حشو ۶ ۳ٖ: یہ علامت پیرن تھیسس یعنی حشو کی ہے، اس سے جملۂ معترضہ معلوم ہو جاتا ہے؛ اس طرح سے کہ یہ جملہ اِن دونوں خطوں کے درمیان میں واقع ہوتا ہے؛ مثلاً:

اگر علم بہتر ہے (اور یہ امر واقعی ہے کہ کسی ذی عقل کے نزدیک محلِّ شک نہیں) تو تم اس دولت کی تحصیل سے کیوں محروم رہتے ہو؟

اس فقرے میں عبارت: ''اور یہ امر واقعی ہے کہ کسی ذی عقل کے نزدیک محل شک نہیں''، جملۂ معترضہ ہے؛ جب کہ یہ عبارت دونوں خط منحنی کے درمیان واقع ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ جملۂ معترضہ ہے۔

(رسالۂ صرف ونحوِ قواعدِ اردو، ص ۱۱)

سرسید (۱۸۷۴ء)

علامتِ جملۂ معترضہ: جب کسی فقرے میں کوئی جملۂ معترضہ آجاوے، تو اس جملۂ معترضہ

کے شروع و اخیر میں یہ علامت لگانی چاہیے، جس سے معلوم ہو کہ وہ ایک علیٰحدہ جملہ ہے جو مطلب کے بیچ میں آ گیا ہے۔

مثال: اس بات کو بہ خوبی جان لو (اور تم کو اتنا ہی جاننا کافی ہے) کہ انسان کے لیے صرف نیکی ہی اصلی خوشی ہے۔

(علاماتِ قرأت، ص ۲۳)

عبدالحق (۱۹۲۶ء)

قوسین: یہ علامتیں خط (—) کی طرح جملۂ معترضہ کے پہلے اور آخر میں لگائی جاتی ہیں:

میرا گھر (یعنی مکان کا وہ حصہ جس میں سکونت ہے) بوسیدہ ہو گیا ہے۔

(یہ لکھنے والے کی مرضی ہے کہ خواہ قوسین استعمال کرے یا خط۔) [طبع دوم میں یہ جملہ زائد ہے۔ ص ۲۷۸]

ہدایات: قوسین کے استعمال کرنے میں اس بات کا بہت خیال رکھنا چاہیے کہ اِن کے بے جا لانے سے عبارت بے ربط نہ ہو جائے۔ بہت سے لکھنے والے اس کی پروانہیں کرتے؛ اور آج کل ایسے اکھڑے ہوئے جملے دیکھنے میں آتے ہیں:

(الف) محمود علی صاحب (جن کے بڑے بھائی الہ آباد میں تحصیل دار ہیں) کو میں نے کل موٹر سائیکل پر جاتے دیکھا۔

(ب) حکیم احمد حسین خاں صاحب (جو اردو محلے میں رہتے ہیں اور بڑے حاذق طبیب ہیں) سے میں نے رجوع کیا۔

(ج) مبارک علی میاں (جو کل آپ سے ملنے آئے تھے) کے پاس ایک اعلیٰ درجے کی بندوق ہے۔

اِن جملوں میں قوسین کا استعمال اس طرح ہونا چاہیے تھا:

(الف) محمود علی صاحب کو (جن کے... ہیں) میں نے.....

(ب) حکیم احمد حسین خاں صاحب سے (جو اردو محلے... طبیب ہیں) میں نے رجوع کیا۔

(ج) مبارک علی میاں کے پاس (جو کل آپ سے ملنے آئے تھے) ایک بڑے اعلیٰ درجے کی بندوق ہے۔

(قواعدِ اردو، ص ۲۴۷)

غلام رسول (۱۹۶۰ء)

قوسین: جملۂ معترضہ کے پہلے اور آخر میں استعمال کیا جاتا ہے۔

مثلاً: محمود کے پاس (جو کل آپ سے ملا تھا) ایک گھڑی بکاؤ ہے۔

(اردو املا، ص ۵۵)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری (۱۹۷۷ء)

مندرجہ ذیل جگہوں میں قوسین کا نشان استعمال ہوگا۔

(الف) کسی لفظ کے معنی، تذکیر و تانیث، واحد جمع یا تلفظ کی وضاحت کے لیے؛ جیسے:

۱- ''خیال'' (موسیقی کی ایک اصطلاح) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرتِ امیر خسرو کی ایجاد ہے۔

۲- شعر کے لیے میٹر (وزن) اور رِدم (آہنگ) دونوں ضروری ہیں۔

۳- معلم (میم مضموم، ماقبلِ آخر مکسور) عربی مصدر، تعلیم کا اسم فاعل ہے۔

۴- جنس (تذکیر و تانیث) کی دو قسمیں ہیں: ایک مصنوعی (غیر حقیقی) اور دوسری حقیقی۔

۵- آب (پانی کے معنوں میں) مذکر ہے۔
(ب) جملۂ معترضہ کے آغاز اور خاتمے پر؛ جیسے:
۱- ہمارے سیاسی رہنما (آپ ان میں سے ایک دو کو چھوڑ دیجیے) باتیں بنانے کے سوا کچھ نہیں کرتے۔
۲- غالب کی شاعری کے متعلق میری رائے (اول تو میری رائے کیا اور اُس کی اہمیت کیا) بہر حال یہ ہے کہ اس کی شاعری بنیادی طور پر جذبے کی نہیں، فکر و نظر کی شاعری ہے۔

(اردو املا اور رسم الخط، ص: ۵۴، ۵۵)

گیان چند (۱۹۹۰ء)

قوسین یا چھوٹا بریکٹ ( ): قوسین میں اُس لفظ یا فقرے کو لکھا جاتا ہے جو بقیہ جملے کے بیچ جملۂ معترضہ کے طور پر الگ سے در آیا ہو۔ میں محسوس کرتا تھا کہ اگر اصل جملے میں قوسین والی عبارت سے پہلے جار[۳] اور مجرور کا فقرہ آئے تو مجرور کو قوسین سے پہلے اور جار کو قوسین کے بعد لکھنا مناسب نہیں؛ بلکہ مجرور اور جار دونوں کو قوسین سے قبل لکھنا چاہیے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مولوی عبدالحق نے قواعدِ اردو میں یہی ہدایت کی ہے۔

غلط: محمود علی صاحب (جن کے بڑے بھائی الہ آباد میں تحصیل دار ہیں) کو میں نے کل موٹر سائیکل پر جاتے دیکھا۔

صحیح: محمود علی صاحب کو (جن کے بڑے بھائی الہ آباد میں تحصیل دار ہیں) میں نے کل موٹر سائیکل پر جاتے دیکھا۔ (قواعدِ اردو، ص ۲۴۷)

قوسین کا دوسرا استعمال کسی متن میں حوالہ درج کرتے وقت ہوتا ہے۔ اسٹائل شیٹ کے مطابق کتاب کا مقامِ اشاعت اور سنہِ اشاعت قوسین کے بیچ لکھا جانا

چاہیے۔ ہم اگر متن کے بیچ حوالہ دیتے ہیں تو اسے، خواہ مصنف کا نام ہو کہ کتاب کا کہ صفحہ نمبر، قوسین میں دیتے ہیں۔ مثالیں پچھلے صفحے پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

بڑا بریکٹ یا مربع بریکٹ [ ] اس کا استعمال اس لفظ یا الفاظ کو محصور کرنے کے لیے کیا جانا چاہیے جو کسی اقتباس یا متن میں مدوِّن یا محقق اپنی طرف سے شامل کرے، مثلاً کسی محذوف لفظ کو قیاساً لکھنے کے لیے؛ مثلاً:

ا- جموں یونیورسٹی میں دیوان ناسخ کے ایک مخطوطے میں ایک قطعۂ تاریخ دیا ہے جس کے عنوان کے ابتدائی الفاظ ضائع ہو گئے ہیں۔ میں انھیں قیاساً پُر کر کے یوں لکھوں گا:

[قطعۂ تاریخ] وفات مرزا محمد تقی خاں بہادر فیل جنگ

ب- ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے مضمون ''شبلی کا اسلوبِ بیان'' میں ناممکن کی جگہ محض ممکن لکھ گئے ہیں۔ ہم اپنی طرف سے ''نا'' کا اضافہ یوں کر کے لکھیں گے:

مگر اس جملے کے پردے میں خود اعتمادی کی مہیب آواز سنائی دے رہی ہے۔ اس کے رعب و جلال سے مرعوب نہ ہونا [نا] ممکن ہے۔

(تحقیق کا فن، ص: ۲۹۰، ۲۹۱)

عرض مرتب (دسمبر ۲۰۲۳ء)

اردو میں قوسین کی تین شکلیں متعارف ہیں:

(۱) چھوٹا قوسین ( ) (Parentheses (or Round Brackets جسے خطوط وحدانی، ہلالین اور ہلالی قوسین بھی کہتے ہیں۔

(۲) بڑا قوسین [ ] (Square Brackets or Box Brackets) جسے عمودی قوسین اور قلابین بھی کہتے ہیں۔ یہ مربع بریکٹ اردو میں Large Bracket کہلاتا ہے، لیکن اردو میں یہ Small Bracket کی صورت ہی میں مستعمل ہے۔

(۳) منجھلا قوسین { } Curly Brackets جس کا استعمال عموماً ریاضی اور لغت میں کیا جاتا ہے اور استعمال کے لحاظ سے اس کی حیثیت بڑے بریکٹ کی سی ہو جاتی ہے؛ لیکن ترقی اردو بورڈ نے اپنی سفارشات میں اسے منجھلا بریکٹ لکھا ہے۔

سطور بالا میں قوسین کے استعمال کی چار صورتیں بیان کی گئی ہیں:

- جملۂ معترضہ کے لیے
- الفاظ کے معنی، تلفظ اور متعلقات کے لیے
- متن کے درمیان حوالے کے لیے
- قیاسی تصحیح کے لیے

قوسین کے استعمال کی اور بھی متعدد صورتیں ہیں، جن کا ذکر سرسید سے گیان چند تک کسی نے نہیں کیا۔

(۱) عہد حکومت اور مدت کار کے لیے؛ جیسے:

اشوک اعظم (۲۷۳ تا ۲۳۲ ق م)، خلجی عہد (۱۲۹۰ تا ۱۳۲۱ء)، اکبر اعظم (۱۵۵۶-۱۶۰۵ء) نواب سید علی حسن خاں ندوۃ العلما کے اعزازی ناظم بھی رہے۔ (۲۰ر دسمبر ۱۹۲۳ء تا ۹ر جون ۱۹۳۱ء)

(۲) شخصی پہچان کے لیے:

- مولانا علاء الدین اصولی (استاد نظام الدین اولیا)
- مولوی اکبر علی تھانوی (برادر اکبر مولانا اشرف علی تھانوی)
- مولوی وحید الدین سلیم (پروفیسر عثمانیہ کالج)
- مولوی عنایت اللہ (ناظمِ دار الترجمہ حیدر آباد)
- پروفیسر ظہیر احمد صدیقی (سابق صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی)

(۳) زمانۂ حیات کی تعیین کے لیے:

- شمس الدین التمش (ف ۱۲۳۶ء)، جہانگیر (ف ۱۷۰۷ء)، مالک رام

(ف ۱۹۹۳ء)، رشید حسن خاں (ف ۲۰۰۶ء)

- شیخ امام بخش صہبائی (۱۸۰۵-۱۸۵۷ء)، سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء)
- ماہنامہ لسان الصدق کلکتہ (۱۹۰۳-۱۹۰۵ء)، دارالترجمہ حیدر آباد (۱۹۱۷ تا ۱۹۵۱ء)

(۴) لفظوں کی متبادل صورت کے لیے:

عمال (گورنر)، کاز (مقصود)، وہی (وہ ہی)، افرادی قوت (Manpower) ناظم (Director) لفظ (کلمہ)، خط (مکتوب، مراسلہ)، مہتمم (پرنسپل) وغیرہ۔

(۵) اضافی معلومات کے لیے:

- سیدی (سی دی بروزن بیوی) یہ حبشی النسل ہونے کی خاندانی علامت ہے۔
- عہد گل کرسٹ کی چھپی ہوئی (نستعلیق ٹائپ) کی کتابوں میں ایک ہی نظام املا سامنے آتا ہے۔
- شبلی کی دونئی تصویریں (بہ عمر تیس سال) انگریزی کتاب ''محمد شبلی نعمانی'' میں پہلی مرتبہ شائع ہوئیں۔
- اس دوران دارالترجمہ حیدر آباد (قیام ۱۹۱۷ء اختتام ۱۹۵۱ء) میں ایک مجلس منعقد ہوئی۔
- فرہنگ آصفیہ کی چاروں جلدوں میں ہمیں (جو ۵۴۰۰۹/الفاظ پر مشتمل ہیں) تقریباً ۵۰۰/انگریزی کے الفاظ نظر آتے ہیں۔
- اردو لغت تاریخی اصول پر (جلد اول ۱۹۷۷ء تا جلد بائیس ۲۰۱۰ء)

(۶) انگریزی ناموں کے صحیح تلفظ اور انگریزی مخففات کے فل فارم کے لیے:

جی۔ ایف۔ آئی گراہم (G.F.I Graham)، جان گل کرسٹ (John Gilchrist)، ڈاکٹر جوزف ہورووٹز (Dr. Josef Horovitz) ڈی۔ ایس۔ سی (D.Sc، ڈاکٹر آف سائنس)، کے۔ سی۔ ایس۔ آئی (KCSI)، Knight

Commander of the order of the star of India.

ان کے علاوہ اور بھی متعدد صورتیں ہیں جن سے عام طور پر ہم واقف ہیں۔ اس کتاب میں بھی یہ تمام صورتیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

جہاں تک مربع بریکٹ کا تعلق ہے تو یہ تحقیق کی ایک علامت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ کسی بھی متن کے درمیان مرتب یا مدوِّن کسی عبارت، لفظ، قول، آیت، شعر وغیرہ کی توضیح، تشریح، تصحیح، تلفظ وغیرہ کے سلسلے میں اپنی جانب سے اگر کوئی جملہ یا لفظ اضافہ کرتا ہے اسے قلابین میں محصور کیا جاتا ہے تاکہ پڑھنے والا بیک نظر سمجھ جائے کہ یہ لفظ، عبارت یا جملہ، مرتب متن کا ہے مصنف متن کا نہیں۔ اس بریکٹ کو عمودی قوسین بھی کہتے ہیں؛ لیکن تحقیق کی اصطلاح میں اسے قلابین کہا جاتا ہے؛ اس بریکٹ کو یہ نام پروفیسر سید محمد سلیم نے دیا ہے۔ باوجودیکہ اس کی ایک خاص پہچان قائم ہو چکی ہے؛ تاہم دیباچے میں اس کی وضاحت کر دینا چاہیے کہ قلابین میں محصور لفظ، عبارت وغیرہ کا تعلق مرتب متن سے ہے۔

بعض لوگوں نے اسے خطوط وحدانی (   ) کے طور پر بھی استعمال کیا ہے؛ مثلاً: رشید حسن خاں کی کتاب فسانہ عجائب، طبع اول ۱۹۹۰ء میں یہ اسی طرح استعمال ہوا ہے۔ ''خطوط شبلی بنام خواتین فیضی'' از راقم میں بھی یہ مربع بریکٹ، متن میں حواشی کے نمبر محصور کرنے کے لیے مستعمل ہوئے ہیں؛ مثلاً: شبلی نے لکھا ہے [۲۳] لیکن آئندہ اس کا استعمال صرف تحقیق و تدوین ہی میں کیا جانا چاہیے۔ قلابین کا یہ انفرادی استعمال ہے، اسے سند نہیں بنایا جاسکتا۔ اس کتاب میں بھی کہیں کہیں علاماتِ اوقاف کو محصور کرنے کے لیے ان کا ضرورتاً استعمال کیا گیا ہے۔

○

واوین Inverted Commas

(‘ ’)(“ ”)

صہبائی (۱۸۴۵ء)

کبھی کسی عبارت میں، عبارتِ مذکورہ بالا کو بطورِ نقل کے تکرار کرتے ہیں تو اس کے امتیاز کے واسطے یہ مقرر ہوا کہ دو معکوس واو، اس عبارت سے پہلے اور دو معکوس واو اس عبارت سے پیچھے لکھے جاویں؛ تا کہ معلوم ہو کہ جو عبارت ان کے بیچ میں واقع ہوئی ہے، بہ طورِ نقل کے ہے؛ مثلاً: مثالِ سابق میں یہ فقرہ:

”اور یہ امر واقعی ہے کہ کسی ذی عقل کے نزدیک محل شک نہیں۔“ جملہ معترضہ ہے۔

(رسالۂ قواعدِ صرف ونحوِ اردو، ص ۱۲)

سر سید (۱۸۷۴ء)

(” “) کوٹیشن یعنی علامت، اقتباس یا نقل کی۔

انگریزی تحریر میں یہ علامت اس طرح پر لکھی جاتی ہے (” “) مگر ہم نے دونوں کو الٹا رہنے دیا ہے......

جب کہ تحریر میں کسی دوسرے کا قول آجاوے یا کسی دوسرے مصنف کی بعینہٖ عبارت اپنی تحریر میں ملادی جاوے، تو اس کے اول اور آخر میں یہ علامت لگادینی چاہیے۔

مثال: باغ کی تعریف اس سے بہتر نہیں ہوسکتی۔'' تو گوئی خوردہ مینا بر خاکش ریختہ وعقد ثریا برتاکش آویختہ'' جب تک آدمی خود اپنا کام نہ کرے بخوبی کام نہیں ہوتا۔ مشہور قول ہے کہ'' آپ کام مہا کام''

رسول خدا صلعم نے فرمایا ہے کہ''عمل نیت پر منحصر ہے'' حدیث کے یہ لفظ ہیں:
''انما الاعمال بالنیات''

(علاماتِ قرأت، ص:۱۳، ۲۳، ۲۴)

عرض مرتب (دسمبر ۲۰۲۳ء):

صہبائی، سرسید اور نوتنوی نے انگریزی علامت کو من و عن قبول نہیں کیا؛ بلکہ عبارت محصورہ کے دونوں جانب دو واؤ معکوس لگانے کی سفارش کی'' ''؛ لیکن مولوی عبدالحق نے انھیں بھی انگریزی طرز پر برقرار رکھا۔

عبدالحق (۱۹۲۶ء)

واوین: جب کوئی اقتباس دیا جاتا ہے، یا کسی کا قول اسی کے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے، تو اس کے اول و آخر یہ علامت لگائی جاتی ہے۔

اس نے جواب دیا'' میں کل دس بجے یہاں آؤں گا۔'' [پہچوں گا: دوم ۲۷۷]

مولانا حالی، میر صاحب کے اس شعر کے متعلق لکھتے ہیں:

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید ہی کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

''میر نے باوجود غایت درجے کی سادگی کے، ایسے مبتذل اور پامال مضمون کو

اچھوتے، نرالے اور دلکش اسلوب میں بیان کیا ہے۔''

(قواعدِ اردو، ص ۲۴۶)

غلام رسول (۱۹۶۰ء)

واوین: جب کوئی اقتباس دیا جاتا ہے یا کسی کا قول اس کے لفظوں میں نقل کیا جاتا ہے تو اُس کے اول اور آخر میں استعمال کیا جاتا ہے؛ مثلاً:

طالب علم نے کہا ''میں ضرور امتحان میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

(اردو املا، ص ۵۴)

گیان چند (۱۹۹۰ء)

واوین: ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی کتاب ۳۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے انھیں ''کوٹیشن یعنی علامت، نقل یا اقتباس کی'' کہا تھا۔ مولوی عبدالحق نے قواعدِ اردو میں انھیں ''واوین'' کہا ہے، ممکن ہے یہ ترجمہ انھیں کا کیا ہوا ہو۔ ان کا استعمال دو موقعوں پر کیا جاتا ہے:

(۱) اقتباس یا قول دینے کے لیے

(۲) کبھی کبھی جملے میں کسی لفظ یا فقرے کو نمایاں کرنے کے لیے۔ مثلاً آخر الذکر کی مثال:

(۱) پہلے ''تواضع نکنم'' کی جگہ ''فروتنی نکنم'' تھا۔ (مالک رام، گفتارِ غالب، ص: ۱۳۲)

ب- اس سے مکمل طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ غالب ''یہاں'' کے مخفف کو ''یاں'' کے بجائے ''یھاں'' مانتے تھے۔ (رشید حسن خاں، ادبی تحقیق، ص: ۱۸۲)

(تحقیق کا فن، ص: ۲۹۱، ۲۹۲)

رشید حسن خاں (۱۹۹۴ء)

واوین: جب کسی کا قول اسی کے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے تو اس کے شروع میں اور آخر میں یہ علامت لاتے ہیں، تاکہ معلوم ہو کہ یہ حصہ باقی عبارت سے الگ ہے اور کسی دوسرے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح جب کسی مشہور شعر کے ٹکڑے کو، کسی خاص ترکیب کو یا نثر کے کسی خاص ٹکڑے کو اپنی عبارت میں لاتے ہیں، تو اس کو ممتاز کرنے کے لیے ''واوین'' میں مقید کر دیتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی لفظ یا الفاظ کے مجموعے کو ایک خاص معنی میں لایا گیا یا ایک خاص طرح استعمال کیا گیا اور پڑھنے والوں کی توجہ اس کی طرف مبذول کرانا ہے؛ اس صورت میں بھی اس لفظ یا ان الفاظ کو واوین کے اندر لکھتے ہیں۔ کبھی بعض اصطلاحوں کو واوین میں لکھا جاتا ہے۔

(عبارت کیسے لکھیں، ص: ۱۳۱)

گیان چند (۱۹۹۰ء)

اکہرے واوین [' '] مندرجۂ سابق واوین کو دوہرے واوین کہنا چاہیے۔ واوین صیغۂ تثنیہ ہے جس کے معنی دو واؤ ہیں؛ لیکن اقتباس کے دونوں طرف ایک ایک واؤ یعنی 'کاما' ہو تو اسے 'اکہرے واوین' کہہ سکتے ہیں۔ اگر کوئی اقتباس دوہرے واوین سے گھرا ہوا ہے اور اس کے بیچ کسی مقولے کو دینا ہے تو اس قول در قول کو اکہرے واوین میں بند کیا جاتا ہے؛ مثلاً:

قرآن حکیم میں لکھا ہے: ''خدا نے 'کن' کہا اور دنیا پیدا ہو گئی۔''

بعض اوقات جملے میں کسی لفظ یا فقرے کو نمایاں کرنے کے لیے دوسرے واوین کی جگہ اکہرے واوین ہی پر اکتفا کر لی جاتی ہے۔ یہ محنت بچانے کے لیے ہے گو اس کی درستی مشتبہ ہے۔ میں بھی بارہا ایسا کرتا ہوں؛ مثال:

دونوں شعروں میں 'باجا' اور 'ساز' کی مناسبت سے 'چھیڑا' کہا ہے۔ (مالک رام: گفتار غالب، ص: ۱۸۷)

(تحقیق کا فن، ص: ۲۹۲)

عرض مرتب (دسمبر ۲۰۲۳ء):

گیان چند نے 'اکہرے واوین' استعمال کرنے کی جو تجویز پیش کی ہے، ان سے پیشتر یہ تجویز پنڈت دتا تریہ کیفی نے کیفیہ میں (ص ۳۵۱) اور غلام مصطفیٰ خاں نے بھی جامع القواعد میں پیش کی تھی۔ (ص: ۲۱۰)۔ فرمان فتحپوری نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے۔ (ص: ۵۵) لیکن گیان چند کی طرح انھوں نے اکہرے واوین کو الگ علامت قرار نہیں دیا، جیسا کہ گیان چند نے کیا ہے۔

یہ تجویز خاکسار کے خیال میں بایں صورت قابل عمل ہو سکتی ہے:

کسی دوسرے مصنف کا مختصر وطویل اقتباس، عبارت، قول یا بیان وغیرہ کو لازماً دوہرے واوین سے نمایاں کرنا چاہیے۔

کتابوں کے طویل نام بھی دوہرے واوین میں لکھنے چاہئیں؛ جیسے:

''قاطع برہان ورسائل متعلقہ''، ''اردو ادب کی تحریکیں'' وغیرہ)

کسی ایک لفظ، حرف، فرد، کتاب اور مقام کے مختصر یعنی دو لفظی یا سہ لفظی ناموں کو اکہرے واوین لگا کر ممیز کیا جانا چاہیے؛ مثلاً:

- حالی کی 'مسدس' نے اپنے دور کے مسلمانوں کے قلب وذہن پر دیرپا اثر چھوڑا۔
- لفظ غالب کی 'غ' کے تنہا عدد 1000 ہوتے ہیں۔
- تلامذہ داغ میں 'بیخود ین' یعنی بیخود دہلوی اور بیخود بدایونی نے خاصی شہرت پائی۔
- علی گڑھ کالج کے لیے 'شبلی' کی بھی نمایاں خدمات ہیں۔
- اے ایم یو کے سبب 'علی گڑھ' دنیا بھر میں مشہور ہے۔

کوئی طویل اقتباس جو دوہرے واوین میں محصور ہے، اس کے متن میں کوئی نام، لفظ یا جملہ ایسا ہے جسے نمایاں کرنا مقصود ہے تو وہاں اکہرے واوین کا استعمال کرنا مناسب ہوگا۔ مثال:

''املا دراصل لفظوں میں صحیح صحیح حرفوں کے استعمال کا نام ہے اور جو طریقہ ان حرفوں کے لکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، وہ 'رسمِ خط' کہلاتا ہے۔ اس بات کو اختصار کے ساتھ یوں بھی کہا گیا ہے کہ 'املا لفظوں کی صحیح تصویر کھینچنا' ہے۔ لغت کی کتابوں میں املا کی تعریف عموماً ایک جملے میں کی گئی ہے: 'رسم خط کے مطابق صحت سے لکھنا'۔ اس میں لفظ 'صحت' کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔'' (اردو املا ص:۲۱)

کمپیوٹر کتابت میں واوین خاصے نمایاں معلوم ہوتے ہیں، لہٰذا اکہرے واوین کے استعمال کو رواج میں لانے میں بظاہر کوئی ہرج نہیں معلوم ہوتا۔

○

حواشی

۱- مُورَّد: کسی دوسری زبان کے لفظوں کو لفظاً یا معناً قدرے تبدیلی کے ساتھ اردو سانچے میں ڈھال لیا جائے تو ایسے لفظوں کو تعریب، تفریس، تہنید کی طرز پر تارید کہتے ہیں؛ مثلاً لارڈ سے لاٹ، افراط وتفریط سے افراتفری وغیرہ۔ عرف عام میں اسے 'اردوانا' کہیں گے۔اسی سے لفظ معرّب، مفرّس، مہنّد اور مورد بنے، بروزن مہذب۔

۲- قامہ: عربی لفظ 'قامۃ' ہے، یہ مصدر ہے کھڑے ہونے کے معنی میں؛ گویا کام کر کے آدمی کھڑا ہوا۔اس پہلو سے وقفہ کے معنی نکالے جاسکتے ہیں۔

۳- مُفرِزہ: جدا کرنے والا،

۴- (:) زوج: لغوی معنی جوڑا، جفت، دو نقطوں کی رعایت سے اسے زوج کہا

۵- (ـ) مد (مراد فل اسٹاپ ختمہ): الف ممدودہ کو کھینچ کر پڑھنے کی علامت (ˆ) مد کے طور پر متعارف ہے؛ لیکن یہاں مراد اس لکیر سے ہے جو ایک مضمون کے ختم ہونے پر دوسرے مضمون کے شروع ہونے سے پہلے کھینچ دیتے ہیں (نوراللغات) یعنی وہی ڈوئی نما لکیر (‾) جو کثرتِ استعمال سے ڈیش کی طرح سیدھی لکیر بن گئی۔اسی لکیر کو صہبائی نے انگریزی ہائی فن کے مماثل سمجھتے ہوئے مد کا نام دیا۔

۶- (!) فاصلہ (مراد فجائیہ/ندائیہ): لغوی معنی دوری یا بُعد کے ہیں۔عروض کی اصطلاح کے طور پر بھی مستعمل ہے۔علامت فجائیہ سے اس لفظ کی نسبت سمجھ میں نہیں آئی۔

۷- فجائیہ: وہ الفاظ جو جوش یا جذبے میں بے ساختہ زبان سے نکل جاتے ہیں؛ جیسے: ہے ہے، واہ، اوہو، ہائے وغیرہ۔

۸- حشو (مراد قوسین): لغوی معنی بے مصرف یا فضول۔علم معانی کی رو سے کلام میں زائد لفظ یا عبارت (جس کے حذف کر دینے سے معنی اور مفہوم میں خلل نہ پڑے) اس جملہ یا لفظ کو کہتے ہیں جس کے نہ ہونے سے متکلم کے عندیہ میں فرق نہ آئے۔غالباً اسی رعایت سے سکتہ کو حشو نام دیا۔

۹- جملۂ معترضہ: ایسا جملہ جس کا اصل عبارت سے تعلق نہ ہو؛ مثلاً شمس بدایونی (جو پیشے سے تاجر ہیں) خود کو جز وقتی ادیب کہتے ہیں۔ قوسین کے اندر لکھا جملہ ''جو پیشے سے تاجر ہیں'' جملۂ معترضہ کہلاتا ہے۔

۱۰- قامات معکوسہ۔ قامہ کی اردو جمع قامات بنالی گئی ہے یعنی الٹے قامے، واوین کو قامات معکوسہ کہنے کی وجہ صرف یہ ہوسکتی ہے کہ [،] کو پہلے 'قامہ' نام دے چکے ہیں۔

۱۱- چار نقطے بنا کر ان کو عمودی خطوں سے آپس میں ملا دینا ❖

۱۲- دیکھیے: حاشیہ نمبر ۵

۱۳- جملہ بالفعل: یعنی ظاہر میں دکھائی دینے والا جملہ۔

۱۴- جملہ بالقوہ: حقیقتاً جملہ ہے، مگر جملے کی صورت میں نہیں۔

۱۵- مبتدا و خبر: جملۂ اسمیہ کا پہلا جُز جس کی بابت کچھ کہا جائے، اسے مبتدا جو کہا جائے اسے خبر کہتے ہیں؛ جیسے۔ اکبر بڑا ذہین بادشاہ تھا۔ اس جملے میں اکبر مبتدا اور بعد کا جملہ اس کی خبر کہلائے گا۔ اسی کو عربی میں مسند اور مسند الیہ کہتے ہیں۔

۱۶- معطوف و معطوف علیہ: وہ کلمہ جو حرف عطف 'و' اور 'یا' وغیرہ کے بعد واقع ہو معطوف اور حرف عطف سے پہلا جملہ معطوف علیہ کہلاتا ہے؛ مثلاً: عقل مند سوچ سمجھ کر بولتا ہے اور جاہل بے سمجھے۔ یہاں 'اور' حرف عطف ہے۔

۱۷- مستثنیٰ، مستثنیٰ منہ: وہ کلمہ یا لفظ جو حرف شرط (مگر یا لیکن وغیرہ) کے بعد آئے، مستثنیٰ کہلاتا ہے۔ وہ شخص یا چیز جس سے استثنا کر کے کسی شخص یا چیز کو علیحدہ کر دیا گیا ہو، مستثنیٰ منہ کہلاتی ہے: جیسے: سب لوگ آئے مگر قاضی صاحب نہیں آئے۔ اس میں 'مگر' حرف شرط ہے۔

۱۸- صلہ و موصول۔ وہ جملہ جو موصول کے بعد اس کے جواب میں واقع ہو اور ان دونوں کے درمیان ایک حرف صلہ بھی آئے۔ اردو میں حرف صلہ اول آتا ہے؛ جیسے۔
جس شخص نے مجھے گھور کر دیکھا، وہ زید تھا۔ اس جملے میں 'جس' حرف صلہ ہے۔ شخص نے گھور کر دیکھا 'موصول'؛ وہ زید تھا، صلہ۔ حروف صلہ: جیسے، جو کچھ، جو کوئی، جہاں، جدھر،

جس کو، جس نے، جیسے، جس کا، جس کی، جیسا، جن کا، جون سا وغیرہ۔

۱۹- کافِ بیانیہ: 'کہ' حرف بیانیہ ہے اور ہمیشہ دو جملوں کو ملانے کے لیے آتا ہے؛ جیسے: 'غالب نے حالی سے کہا 'کہ' میں بے استاد ا ہوں۔'' یہاں حرف 'کہ' کاف بیانیہ ہے۔ کافِ تردیدیہ: 'کہ' کبھی کبھی انکار کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ وہ لفظ جو ایک بات کو رد کر کے دوسری بات لائے؛ مثلاً: خواہ، چاہے، یا، یا تو، کہ وغیرہ۔

۲۰- شرط و جزا: وہ حروف جو شرط کے موقع پر بولے جائیں۔ حروف شرط یہ ہیں: اگر چہ، اگر، گو، جوں، جو، جوں جوں، جوں ہی، جب، جب تک، تاوقتیکہ وغیرہ، مثلاً: اگر علم حاصل کرو گے تو عزت پاؤ گے۔ اس جملے میں 'اگر' حرف شرط ہے۔ علم پڑھو گے شرط، تو عزت پاؤ گے جزا، یہاں 'تو' حرف جزا ہے۔ شرط و جزا مل کر جملہ شرطیہ ہوا۔

۲۱- دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۸

۲۲- دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۷

۲۳- دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۵

۲۴- دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۶

۲۵- دیکھیے حاشیہ نمبر ۲۰

۲۶- دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۸

۲۷- دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۷

۲۸- فرمان فتحپوری نے حروفِ ابجد کو مختلف شقوں کے بیان میں استعمال کیا ہے؛ لیکن لفظ سین سے یہ ترتیب بگڑ گئی۔

۲۹- حرف استثنا: وہ لفظ جو ایک چیز کو دوسری چیز سے جدا کرے؛ جیسے: جز، سوا، مگر، الّا وغیرہ جس چیز کو اوروں سے جدا کرتے ہیں اس کو مستثنیٰ کہتے ہیں۔ اور جو لفظ مستثنیٰ کو مستثنیٰ منہ سے علیحدہ کرتا ہے اس کو حرفِ استثنا کہتے ہیں؛ جیسے: مشاعرے میں سب پہنچے مگر آپ نہیں۔ یہاں 'مگر' حرف استثنا ہے۔

۳۰- حرفِ استدراک: وہ لفظ جو پہلے جملے کے شبہ کو دور کرے؛ مثلاً: مگر، لیکن، البتہ، سو، پر وغیرہ۔ پہلے جملے سے جو شبہ پڑتا ہے حرف استدراک اسے دور کردیتا ہے؛ جیسے: یوں نہیں کہا 'البتہ' یوں کہا تھا؛ وہ پڑھا لکھا سہی 'لیکن' قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ پہلے جملے میں حرف 'البتہ' اور دوسرے میں 'لیکن' استدراک ہے۔

۳۱- حرفِ توجیہ: وہ حرف جو کسی بیان کی توجیہ کے لیے آئے؛ جیسے: وہ زندگی میں کامیاب رہا اس لیے کہ وہ محنتی اور ایماندار تھا یہاں 'اس لیے' حرف توجیہ ہے۔

۳۲- ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اپنی کتاب ''اردو املا اور رسم الخط'' میں غلام مصطفیٰ خاں کا یہ بیان اس طرح لکھا ہے: ''خاں صاحب نے جامع القواعد میں بتایا ہے کہ کسی عبارت یا پیراگراف کے آخر میں لفظ 'مثلاً' اور 'جیسے' کے بعد بھی وقفہ کا نشان لگے گا۔ (ص ۴۸) میرا خیال ہے کہ یہاں کتابت کی غلطی سے 'پہلے' کی جگہ 'بعد' رقم ہوگیا۔

۳۳- دیکھیے حاشیہ نمبر ۴

۳۴- دیکھیے حاشیہ نمبر ۳۱

۳۵- دیکھیے حاشیہ نمبر ۷

۳۶- دیکھیے حاشیہ نمبر ۸

۳۷- حرف جار: وہ لفظ جو اسم کو فعل یا مشابہ فعل سے ملائے؛ مثلاً: سے، پر، میں، تک وغیرہ اردو کے حروفِ اضافت کا، کی، کے کو بھی حرف جار کہتے ہیں۔ جیسے: شبلی کی الفاروق مستند کتاب ہے۔ اس جملے میں حرف جار 'کی' سے پہلے آنے والے اسم، شبلی کو مجرور کہتے ہیں۔

۳۸- اصول تحقیق و ترتیب متن، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، طبع شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی، اول ۱۹۷۷ء

اضافی یا اختیاری اوقاف

انگریزی میں رموزِ اوقاف کی تعداد خاکسار کے علم میں ۲۶ ہے۔ ان میں سے آٹھ اوقاف کو اردو برادری نے اجتماعی طور پر قبول کرلیا ہے اور انھیں اردو کے تصنیفی و تالیفی سماج کی منظوری بھی حاصل ہوچکی ہے۔ جس طرح دوسری زبانوں کے دخیل الفاظ نے اردو کا قالب اختیار کرلیا ہے اور وہ 'موڑَد' (بروزن مکمل) کہلاتے ہیں؛ بعینہ یہی حال زیرِ تحریر اوقاف کا بھی ہے؛ اِن کے اپنے اردو نام ہیں اور یہ اردو رسم الخط کی رعایت سے قدرے مبدل صورت میں مستعمل ہیں؛ بایں طور انھیں اب اردو کے اپنے اوقاف سمجھا جانے لگا ہے؛ گویا یہ بھی موڑَد ہوگئے ہیں۔ رشید حسن خاں نے لکھا ہے:

''آٹھ علامتیں مروّج ہیں، اور ان علامتوں کو پابندی کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے، خاص طور پر نصابی کتابوں میں ان کو لازماً استعمال کیا جانا چاہیے، اور تدوین میں بھی ان کے استعمال کو لازم قرار دینا چاہیے۔''

(اردو املا، ص ۵۴۸)

مذکورہ آٹھ اوقاف کے علاوہ انگریزی میں اوقاف کے جو دوسرے نشانات ہیں، وہ اردو رموزِ اوقاف کے بجائے ''اردو علامات'' میں شمار کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ اردو میں مستعمل ہیں؛ جیسے: Ellipses نقطے (...)، Equals علامت

مساوی (=) وغیرہ۔

کچھ علامتیں وہ ہیں جو اردو میں ایک زمانہ سے مروج چلی آرہی ہیں؛ جیسے: علامت پھول (*) Asterisk، لکیر یعنی خط بالائی (—) ممتاز اسما کے اوپر لگانے والی لکیر، انگریزی میں Under Line، یعنی خط زیریں، علامت جمع یا صلیب (+) Plus، علامت چلیپا (×) Cross وغیرہ۔

لہٰذا یہ طے کر پانا مشکل ہے کہ ان کی اصل عربی اور فارسی کے سرمایۂ مخطوطات میں تلاش کی جائے یا انھیں بھی انگریزی پنکچوئیشن کا جز سمجھ لیا جائے۔ یہ مسئلہ بہر حال تحقیق طلب ہے۔

سر دست طے شدہ آٹھ اوقاف کے علاوہ ''اردو لغت تاریخی اصول پر''، ''اردو انسائیکلوپیڈیا''، ''اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ'' یا اسی طرح کے چند اور بڑے کاموں میں جو اوقاف دیکھے گئے ہیں، سطور ذیل میں ان کا اشاریہ دیا جا رہا ہے؛ یہ اس لیے کہ اردو کا قاری ان اجنبی اوقاف سے واقف ہو سکے اور یہ جان لے کہ یہ علامتیں انگریزی پنکچوئیشن ہی سے برآمد کی گئی ہیں؛ اور انگریزی پنکچوئیشن ہی کا حصہ ہیں۔ طے شدہ اردو رموزِ اوقاف سے ان کا تعلق نہیں۔

(:—) تفصیلیہ Colon and Dash، رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''یہ علامت ...استعمال عام میں جگہ نہیں پا سکی۔ مولوی صاحب مرحوم نے مثالاً ایک یہ جملہ بھی لکھا ہے: ''ہندوستان کے بڑے شہر یہ ہیں:- (۱) بمبئ (۲) کلکتہ (۳) حیدر آباد (۴) مدراس......'' مگر یہ فائدہ اب ''رابطے'' (Colon) ہی سے اٹھایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ استعمالاً ان دونوں علامتوں میں معمولی سا فرق ہے، اور اس فرق کو بہ آسانی نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور کیا جا چکا ہے؛ اس بنا پر [اس علامت کو] اس مقالے میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔''

(اردو املا، ص: ۵۴۷)

Dash خط(—)

رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''اس کے لیے مولوی صاحب مرحوم نے لکھا ہے کہ ''یہ علامت، جملہ معترضہ کے پہلے اور آخر میں لگائی جاتی ہے۔'' اور مثلاً یہ جملہ لکھا ہے ''میری رائے — اگر چہ میں کیا اور میری رائے کیا'' — تو یہ ہے کہ آپ اس سے دست بردار ہو جائیں۔ مگر یہ علامت رواج عام میں جگہ نہیں پا سکی اور یہ کام بھی ''کاما'' سے لیا جانے لگا۔''

(اردو املا، ص: ۵۴۷)

Hyphen زنجیرہ(v)

رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''مولوی صاحب مرحوم نے اس کے متعلق لکھا ہے:

''یہ علامت اُن مرکب اجزا کے درمیان لگائی جاتی ہے جن کے متعلق خیال ہوتا ہے کہ بغیر اس علامت کے، وہ علیحدہ علیحدہ لفظ سمجھے جائیں گے۔ خاص طور پر علوم کی مرکب اصطلاحوں میں اس کا لگانا ضروری ہے۔'' یہ اصطلاح جیسا کہ مولوی صاحب نے خود بھی لکھا ہے (زنجیرے کا استعمال اب تک نہیں کیا گیا) اب تک استعمال میں نہیں آپائی ہے۔ مولوی صاحب نے یہ دو مثالیں بھی لکھی ہیں: روسی v جاپانی صلح نامہ (جو روس اور جاپان کے مابین ہوا ہے) ''کل v ہندی'' (All-India) مگر لکھاوٹ میں ''روسی جاپانی صلح نامہ'' اور ''کل ہندی'' لکھے جاتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ سائنس وغیرہ کی اصطلاحوں میں اس کی ضرورت پیش آئے، وہاں اس کو شاید استعمال کیا جائے، مگر عام کتابوں میں نہ اس کا گزر رہا ہے اور نہ اس کا وجود ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس علامت کو بھی اس مقالے میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

(اردو املا، ص: ۴۴۷، ۴۴۸)

مذکورہ بالا تینوں اوقاف کو رشید حسن خاں نے متروک قرار دیا ہے۔ گیان چند

نے بھی ان کو متروک کی فہرست میں رکھا ہے؛ لیکن یہ امر توجہ طلب ہے کہ زنجیرہ کے علاوہ تفصیلیہ اور خط دونوں علامتیں ۱۹۲۶ء سے ۱۹۷۷ء یعنی نصف صدی تک محدود طور پر ہی سہی استعمال میں رہی ہیں۔ انجمن ترقی اردو کی مطبوعات میں تو ان کا اہتمام کیا ہی جاتا تھا؛ دارالترجمہ حیدرآباد، دارالمصنفین اعظم گڑھ اور ندوۃ المصنفین دہلی کی کتابوں میں بھی یہ علامتیں نظر آجاتی تھیں۔ نصابی کتب میں بھی ان کا استعمال اور تعارف شامل رہا ہے؛ لہٰذا راقم الحروف نے محتاط رویہ اختیار کرتے ہوئے ان کو اضافی رموزِ اوقاف کی فہرست میں شامل کرلیا ہے۔ عصرِ حاضر کے قلم کاروں کو ان اوقاف کے استعمال سے اجتناب کرنا چاہیے۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ مولوی صاحب نے ''زنجیرہ'' کے نام سے جو علامت (v) دی ہے وہ انگریزی کی V سے مشابہ ہے اور دوسرے اوقاف کی طرح یہ انگریزی علامت نہیں ہے۔ انھوں نے اس کا متبادل Hyphen قرار دیا جب کہ ہائی فن (-) خود ایک علامت ہے جو ختمہ کے طور پر فل اسٹاپ کی جگہ اردو میں مستعمل ہے۔ اس اشکال کو مولوی صاحب نے زنجیرہ علامت کے تعارف کی آخری سطور میں رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

دوسری بات یہ ہے کہ انگریزی (-) Hyphen ہمارے یہاں پورے وقفے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس لیے کسی اور علامت کی ضرورت تھی۔''

(قواعدِ اردو، ص: ۲۴۹)

یہ وضاحت اگر علامت کی ابتدا میں کردی جاتی تو اشکال کی گنجائش نہیں رہتی۔ قاری یہ سمجھ جاتا کہ زنجیرہ کی علامت فی الواقع ہائی فن نہیں بلکہ علامتِ زنجیرہ ہائی فن کا بدل ہے اور اردو میں ہائی فن کے مفہوم کے عین مطابق۔

({ }) منجھلا بریکٹ Braces

سطور گذشتہ میں قوسین کے تحت اس کا اندراج کیا جاچکا ہے؛ لیکن اس کی صحیح جگہ

یہی ہے؛ کیونکہ اس کا استعمال شاذ ہے۔ عموماً یہ ریاضی یا لغات میں مستعمل ہے۔

حسب ذیل پانچ انگریزی پنکچوئیشن اردو میں ''رموزِ اوقاف'' میں نہیں ''علامات'' میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کو مقالے میں علامات کے تحت ہی شامل کیا گیا ہے۔

(=) علامتِ مساوی یا تسویہ Equals

(+) علامت تجزیہ یا جمع Plus

(×) علامتِ چلیپا یا صلیب Cross

(...) نقطے یا علامتِ نقاط Ellipses or three dots

(/) آڑا خط/ خط فصل Slash or Oblique

نمونۂ لغات اردو، مرتبہ ترقی اردو بورڈ کراچی، ضمیمہ سہ ماہی اردو کراچی، شمارہ نمبر پنجم ۱۹۶۱ء اور اردو لغت تاریخی اصول پر جلد اول، ترقی اردو بورڈ کراچی ۱۹۷۷ء میں جن علاماتِ اوقاف کے استعمال کی فہرست دی گئی ہے، ان میں حسب ذیل سات انگریزی پنکچوئیشن بھی شامل ہیں:

(<) ماخوذ از کے معنی میں Derived from (بحوالہ نمونۂ لغات اردو)

(>) مبدل بہ کے معنی میں Changed to (بحوالہ نمونۂ لغات اردو)

(—) سیدھا خط Em Dash ذیلی الفاظ سے ماقبل؛ مثلاً از، — بس — بسکہ

(*) پھول Asterisk

یہ علامت قدیم ہے۔ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ (جامعہ پنجاب) کی ۲۴ جلدوں میں سارے مقالات مسلسل شامل کیے گئے ہیں۔ پہلے مقالے کو دوسرے سے ممیتز کرنے کے لیے مقالے کے عنوان کے ساتھ اس پھول کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ اب سے پہلے یہ پھول سررشتۂ تعلیم پنجاب کی درسی کتب میں فل اسٹاپ کی جگہ استعمال کیا جاتا تھا، اور اس سے بھی پہلے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی مطبوعات میں پیراگراف کے

خاتمے یا جملے کے خاتمہ پر اس کا استعمال کیا جاتا تھا۔

(●) نقطہ Bullet point

اردو کی قدیم کتب میں یہ گول نقطہ دیکھا گیا ہے، جسے علامات کے تحت پیش کیا جا چکا ہے۔ انگریزی پنکچوئیشن میں شامل یہ نقطہ فہرست یا مختلف شقوں میں لکھی جانے والی چیزوں کے شروع میں لگایا جاتا ہے؛ جیسے:

● ختمہ

● سکتہ

● وقفہ اس طور اردو میں یہ آج بھی مستعمل ہے۔

(~) متبادلہ یا مد Tilde or Alternate

یہ بات ظاہر کرنے کے لیے کہ اس کے بعد لکھا ہوا لفظ یا فقرہ اصل لفظ کی متبادل صورت ہے۔

(>> >>) گیومہ Guillemets درمیان متن برائے تشریح مزید (بحوالہ نمونہ لغات اردو)

○

رموزِ اوقاف، کب، کہاں اور کیوں؟

تصنیف وتالیف کے دوران ایک عام مصنف اور مطالعہ کے دوران ایک قاری کے ذہن میں رموزِ اوقاف کے استعمال سے متعلق متعدد سوالات پیدا ہوتے ہیں؛ لیکن ان کے جوابات عموماً نہیں مل پاتے اور وہ سوالات ہمیشہ کے لیے ذہن سے محو یا معدوم ہو جاتے ہیں۔ سطورِ آیندہ میں ایسے ہی کچھ سوالات قائم کیے گئے ہیں اور ان کے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

س: زمانۂ قدیم میں ہر قلمی یا مطبوعہ رسالے، دیوان، کتاب وغیرہ کے آخر میں اختتامِ کتاب کا اعلان و اظہار کیا جاتا تھا۔ مقصد یہ ہوتا تھا کہ اوراقِ کتاب کے منتشر یا درمیان سے ضائع ہو جانے کے باوجود یہ جانا جا سکے کہ کتاب کا خاتمہ کس صفحے پر ہوا ہے۔ اس کے لیے بیشتر تمت، تمت تمام شد، ختم شد اور فقط جیسے الفاظ لکھے جاتے تھے۔ سالِ تحریر یا اشاعت سے متعلق تاریخی قطعات اور چند نثری یا منظوم تقریظات بھی کتاب کے خاتمہ کا مظہر ہوتی تھیں۔ کیا آج اس طرح کی کوئی لفظی یا نشان پر منحصر علامت کی ضرورت ہے؟

ج: خاکسار کو موجودہ دور میں اس طرح کی کوئی علامت نظر نہیں آئی۔ کمپیوزیٹر یا کاتب اختتامِ مضمون اور کتاب پر کچھ گولے، ستارے، چوکور بریکٹ، کچھ لکیریں وغیرہ بنا دیتے ہیں، جن سے بادی النظر میں یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ یہاں

مضمون یا کتاب کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ ان کو کمپیوٹر کی اصطلاح میں کیا کہتے ہیں؟ متعدد کمپیوٹر ماہرین سے رابطہ کرنے کے باوجود صحیح جواب نہیں مل سکا۔ عام طور پر اردو کمپوزنگ کرنے والے انھیں The end symbols بولتے ہیں؛ لیکن اردو کا مصنف اور قاری جس طرح سکتہ، وقفہ، رابطہ، ختمہ وغیرہ کی پہچان رکھتا ہے اور ان کا حسبِ موقع استعمال بھی کرتا ہے، اِن کی اس طرح سے پہچان نہیں رکھتا۔ ہاں وہ اتنا ضرور سمجھ لیتا ہے کہ یہ خاتمۂ مضمون یا خاتمہ کتاب کی طرف اشارہ کررہے ہیں۔

تحقیقی کتابوں میں کتاب کے خاتمہ کا اعلان ایک طرح سے کتابیات اور اشاریہ وغیرہ ہوتے ہیں؛ لیکن شعری و افسانوی مجموعوں، ناولوں، تنقیدی کتابوں میں اس طرح کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے کتاب کے اختتام کا پتہ لگ سکے؛ سوائے کتاب کے ریپر یا جلد کے۔ لہٰذا یہ سوال اپنے آپ میں بہت اہم ہے اور اس کے لیے کوئی علامت تجویز کی جانی چاہیے۔

شمس الرحمٰن فاروقی (ف ۲۰۲۰ء) نے اپنی متعدد تصانیف میں 'خاتمۂ کتاب' کا اہتمام کیا تھا۔ یہ خاتمہ وہ کتاب کے اخیر صفحے پر بہ زبان فارسی لکھتے تھے، تاکہ وہ نمایاں اور ممتاز رہے۔ یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ قدیم کتب میں اس کا التزام کیا جاتا تھا۔ اکثر یہ مصنف کی طرف سے ہوتا تھا اور بعد از وفاتِ مصنف، ناشر کی طرف سے۔ فاروقی کی ایسی تین کتابیں میرے علم میں ہیں، جو یہ ہیں:

(۱) شعر شور انگیز، ج/۴ (مطبوعہ دہلی، بار اول ۱۹۹۴ء)

(۲) تنقیدی افکار (دہلی، ۲۰۰۳ء)

(۳) لغات روزمرہ (دہلی، اول ۲۰۰۳ء)

کسی نے بھی اس اندراج کی داد نہ دی اور یوں یہ 'خاتمۂ کتاب' رواج میں نہیں آسکا۔

راقم الحروف نے اپنی نئی کتاب ''غالب- کچھ تحقیق کچھ تنقید'' میں چند سطریں بہ طورِ 'خاتمہ کتاب' بہ اتباعِ فاروقی لکھی ہیں۔ یہ کتاب ورلڈ ویو پبلشرز لاہور نے فروری ۲۰۲۴ء میں شائع کردی ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں بھی چند سطریں بہ طورِ 'خاتمہ کتاب' لکھی گئی ہیں۔

راقم الحروف کے خیال میں مضمون کے اختتام کے لیے نشان پر منحصر کوئی علامت طے کر لینی چاہیے اور کتابوں کے لیے لفظی علامت کا استعمال کیا جانا چاہیے۔ قدیم علامت، ختم شد، یا تمام شد بھی اختیار کی جا سکتی ہے۔

س: 'مثلاً' یا 'جیسے' سے پہلے اور بعد کون سی علامت لگانی چاہیے؟ ماضی میں 'مثلاً' یا 'جیسے' سے پہلے سکتہ اور ختمہ دونوں دیکھے گئے ہیں اور 'مثلاً' کے بعد کچھ نہیں۔

ج: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے جامع القواعد میں اس مسئلے کا یہ حل پیش کیا ہے کہ مثلاً سے پہلے وقفہ (؛) اور مثلاً کے بعد رابطہ (:) لگانا چاہیے۔ اس کتاب میں اسی کا اتباع کیا گیا ہے۔

س: حروف عطف 'و' اور 'کہ' 'تا کہ' وغیرہ سے پہلے مولوی عبدالحق نے 'قواعد اردو' میں اور رشید حسن خاں نے 'اردو املا' میں سکتہ (،) لگایا ہے؛ کیا یہ درست ہے؟

ج: اصولی طور پر درست نہیں، لیکن جہاں جہاں آپ کی سانس ٹوٹتی ہے یا آپ توقف کرتے ہیں وہاں سکتہ لگانے میں ہرج نہیں۔ دراصل رموزِ اوقاف کے لیے جو اصول وضع کیے گئے ہیں وہ عروض کی طرح کے اصول نہیں جن کی پابندی بہ ہر طور لازمی ہے۔ اس میں بہت کچھ آپ کے ذوق لطیف کا بھی دخل ہے کہ کس جگہ آپ علامت لگانا پسند کرتے ہیں اور کس جگہ نہیں؛ لیکن یکسانیت اور معیار بندی کا بہر حال لحاظ رکھنا چاہیے۔

س: سیمی کولن (؛) یعنی وقفہ کے بغیر بھی نثر کا کارواں برسہا برس سے رواں دواں ہے، پھر ایسی علامت جو برائے تکلف ہے، اسے جاری رکھنا کہاں تک

درست ہے؟

ج: ہر جملہ کا اختتام وقف تام یا وقف کامل پر ہوتا ہے۔ سیمی کولن، وقف کامل یعنی ختمہ کا نصف وقفہ ہے اور سکتہ سیمی کولن یعنی وقفہ کا بھی نصف ہے، اسے ایک لکیر کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کیجیے:

وقف تام یعنی ختمہ (۔) ——وقف تام
نصف وقف یعنی وقفہ (؛) ——وقفہ
پاؤ نصف یعنی سکتہ (،) ——سکتہ

ہوتا یہ ہے کہ لکھتے وقت ہم جملوں کی ناپ تول نہیں کرتے؛ بلکہ بیساختہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ جملہ کی ساخت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کے وقفوں کو تقسیم کریں اور اسی اعتبار سے اوقاف کا استعمال کریں۔ کچھ دن کی مشق سے ذہن خود بخود جملوں کی تمیز کرنے لگے گا اور حسب موقع اوقاف کے استعمال کی راہ ہموار ہو جائے گی۔

س: کیا حوالہ جات اور حواشی میں سالِ اشاعت یا صفحہ نمبر کے اندراج کے بعد ڈیش لگانا درست ہے؟ مثلاً: مزارِ غالب، ڈاکٹر شمس بدایونی، غالب اکیڈمی دہلی، ۲۰۱۱ء۔، تفہیم غالب کے مدارج، ص ۲۱۱۔

ج: پاکستانی کتب میں سنہ اور صفحہ نمبر کے آخر میں ڈیش لگانے کا رواج ہو گیا ہے، میرے خیال میں یہاں ڈیش کی ضرورت نہیں ہے۔

س: جملے کے خاتمے پر ڈیش لگایا جاتا ہے، اتفاق یہ کہ یہیں حوالہ نمبر بھی دینا ہے، اس صورت میں حوالہ نمبر ختمہ کے بعد دینا چاہیے یا ختمہ حوالہ نمبر کے بعد لگانا چاہیے؟

ج: بہ ظاہر تو جملے کے اختتام پر ختمہ لگا دینا ہی درست ہوگا؛ لیکن جملہ کا اختتام حاشیہ نمبر سے بھی جڑ گیا ہے، لہٰذا حاشیہ نمبر کے اندراج کے بعد ہی ختمہ یعنی ڈیش لگانا

چاہیے۔ اگر کوئی شخص پہلے ڈیش لگاتا ہے اور بعد میں حوالہ نمبر کا اندراج کرتا ہے تو یہ بھی معیوب نہیں۔ دونوں صورتوں کی مثالیں حسب ذیل ہیں:

''شیخ محمد اکرام کا خیال ہے کہ ''پنج آہنگ'' ۱۸۴۰ء کے قریب مرتب ہوئی[11]۔ لیکن وزیرالحسن عابدی نے ایک ایسا نسخہ بھی دیکھا جس کا سال کتابت ۱۸۳۵ء ہے۔[12]

س: کتابیات یعنی حوالہ جات کی فہرست میں بعض مقامات تفصیل طلب ہوتے ہیں، کیا ایسے مقامات پر قوسین کا استعمال کرنا صحیح ہے؟

ج: یہ حوالے کی نوعیت پر منحصر ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ اس میں قوسین کے استعمال سے بچنا چاہیے۔ قوسین کو صرف متن تک محدود رکھنا چاہیے۔ ناگزیر حالات میں استعمال کرنے میں کوئی ہرج بھی نہیں۔ آج کل پاکستانی کتب کے حوالہ جات میں یہ بہ کثرت استعمال کیا جارہا ہے۔

مثال: پاکستانی اندراج: خلیق انجم (مرتب) غالب کے خطوط، ج/۲، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۸ء، [اشاعت دوم]

ہندوستانی اندراج: غالب کے خطوط، ج/۲، مرتبہ خلیق انجم، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، طبع دوم ۱۹۹۸ء

س: جب درمیان متن کوئی حوالہ دیا جائے، یا کسی ایسے ادارے کا ذکر ہو جس کے نام کے ساتھ مقام کا اندراج بھی ضروری ہو تو قوسین کے استعمال کی صورت کیا ہوگی؟

ج: جب متن کے درمیان حوالہ دیا جائے تب مقام اشاعت اور سال اشاعت کا اندراج کریں گے، یعنی پورا حوالہ دیں گے، مثلاً:

سید معین الرحمٰن نے وزیرالحسن عابدی کے مرتبہ ''نسخۂ گل رعنا'' (ادارۂ تحقیقات پاکستان، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء) کے مقدمہ پر اعتراضات کیے۔

یہاں سنہ کے اندراج کے بعد ڈیش نہیں لگایا جائے گا۔

اور جب کسی ادارے کا ذکر ہو تو اس ادارے کے جائے وقوع کو قوسین میں لکھنا درست ہوگا؛ جیسے: یہ نسخہ حافظ محمود شیرانی کی ملکیت تھا اور اب پنجاب یونیورسٹی (لاہور) کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ مجلس ترقی ادب (لاہور) نے اس نسخے کا عکس شائع کیا تھا۔

س: کیا عبارت یا حوالے میں متصل دو قوسین استعمال کیے جا سکتے ہیں؟ جیسے: اردو نعت کا شعری محاسبہ (تنقید) (۱۹۸۸ء)

ج: میری دانست میں متصل قوسین کا استعمال درست نہیں۔ یہاں ایک قوسین سے کام چل سکتا تھا: اردو نعت کا شرعی محاسبہ (تنقید، ۱۹۸۸ء)

س: کیا قوسین کے بعد ڈیش لگانا درست ہے؟

ج: ڈیش کا تعلق جملے یا عبارت کے خاتمے سے ہے۔ اگر کوئی عبارت قوسین پر تمام ہوتی ہے (حالانکہ یہ بہت بھدا طریقہ ہے) تو استعمال کرنے میں ہرج نہیں۔

س: واوین سے پیشتر اور واوین کے بعد کچھ لوگ ختمہ، سکتہ یا وقفہ لگاتے ہیں اور بعض لوگ کچھ بھی نہیں لگاتے، اس کی صحیح ترین صورت کیا ہے؟

ج: واوین عبارت یا جملے کے کسی لفظ یا حصے کو نمایاں کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ کام کبھی کبھی خط بالائی سے بھی لیا جاتا ہے۔ لہٰذا جملے کے تقاضے کے مطابق سکتہ، وقفہ یا ختمہ کا استعمال کرنا چاہیے۔ واوین بذاتہ اوقاف لگانے میں کہیں بھی مانع نہیں۔

س: صفحہ نمبر کے لیے لفظ ص مخفف کے بعد مالک رام کولن یعنی رابطہ کا استعمال کیا کرتے تھے؛ مثلاً:

تلامذۂ غالب، ص: ۲۹، تذکرۂ معاصرین ج/۱، ص: ۴۵

ج: میرا خیال ہے کہ اگر لگاتار صفحات کے اندراج ہوں؛ مثلاً: غبارِ خاطر،

ص: ۴۰، ۲۰۸، ۲۱۸ تب رابطہ کا استعمال کرنے میں کوئی ہرج نہیں اور اگر صرف ایک اندراج ہے تو رابطہ (:) کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

س: جب کسی طویل اقتباس کو نیچے کی سطروں میں دونوں جانب مارجن چھوڑ کر نقل کیا جائے تو اس اقتباس کو واوین میں مقید کرنا کیا درست ہوگا؟

ج: اصولی طور پر تو واوین کی ضرورت نہیں، لیکن اردو کے تمام معتبر ادیب ایسے تمام مقامات پر واوین کا استعمال کرتے چلے آرہے ہیں؛ لہٰذا یہاں واوین کا استعمال، لکھنے والے کی اپنی پسند پر چھوڑ دینا چاہیے۔

س: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ رموزِ اوقاف کا استعمال صرف نثر میں کرنا چاہیے شعر میں نہیں۔ ان کے استعمال سے شعر کی معنوی جہتیں متاثر ہوتی ہیں۔ یہ بات کس حد تک درست ہے؟

ج: شمس الرحمٰن فاروقی مرحوم بھی شعر پر رموزِ اوقاف کے استعمال کو پسند نہیں کرتے تھے۔ دراصل شعر میں سکتہ، سوالیہ اور فجائیہ کے علاوہ باقی اوقاف استعمال کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ہمارے محترم محققین امتیاز علی خاں عرشی، مالک رام، کالی داس گپتا رضا نے دیوانِ غالب کی تدوین میں ان کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ رشید حسن خاں نے بھی شعری متون کی ترتیب اور ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' میں ان کے استعمال کو روا رکھا ہے۔ اس لیے غلو کی حد تک ان کے استعمال سے خواہ نثر ہو یا نظم پرہیز کرنا چاہیے؛ لیکن انھیں نظم و شعر کے لیے شجرِ ممنوعہ سمجھنا درست نہیں ہوگا۔

س: مخففات: الخ، کذا، رک (ے) وغیرہ کی جگہ بعض لوگ جدید علامتوں کے استعمال کے حق میں ہیں؛ اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے؟

ج: الخ کی جگہ تین یا تین سے زائد نقطے (...)، کذا کی جگہ علامتِ سوالیہ [؟] رجوع کنید، رک کی جگہ دیکھیے، علامت شعر (ے) کی جگہ رابطہ یعنی کولن (:)

کے استعمال کی سفارش غلط نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ دونوں کو رواج میں رکھا جائے۔ مخففات کا استعمال صرف تحقیق و تدوین میں اور اوقاف (...)، (؟)، (:) کا استعمال تحقیق و تدوین کے علاوہ کیا جا سکتا ہے یا کیا جانا چاہیے۔

س: حوالہ جات میں صفحہ کے لیے 'ص' اور صفحات کے لیے ص ص، ”ص یا صص لکھے جاتے ہیں۔ الخ، کذا، رک کی طرح حرف صاد سے بھی دستبرداری کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

ج: میرا خیال ہے کہ صفحے کے 'ص' کو واحد اور جمع دونوں کا حامل سمجھنا چاہیے۔ خاکسار نے کبھی دو صاد کا استعمال نہیں کیا۔ میری نظر میں دو صاد 'صص' یا 'ص ص' کا استعمال محض تکلف ہے۔ ص کوئی مستقل لفظ نہیں جس کی واحد اور جمع طے کی جائے۔ اس حرف کا مقصدِ استعمال صرف صفحہ یا صفحات نمبر کی نشاندہی کرنا ہے، اس سے زیادہ اس کا مصرف نہیں۔

اردو کے ممتاز محققین امتیاز علی خاں عرشی، مالک رام، پروفیسر نذیر احمد (ف ۲۰۰۸ء) وغیرہ اپنی تحریروں میں بین السطور اور پاورقی حواشی میں مختصر ترین حوالے دیا کرتے تھے۔ کتاب کا نام لکھ کر اس کے آگے جلد کی ج کی جگہ صرف جلد نمبر اور صفحہ نمبر کے ص کی جگہ صرف کولن یعنی رابطہ لگاتے اور نمبر لکھ دیتے تھے؛ جیسے (دیوان حافظ :۲۹)، (قاطع برہان و رسائل متعلقہ :۲۲۱)، (قاموس المشاہیر،۲:۱۴۱) خمخانہ جاوید، ۴:۲۶۸)، (تذکرہ معاصرین،۳:۲۰۵)

میرا خیال ہے کہ اس طریقہ کار میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ صرف یہ لحاظ رکھا جائے کہ عبارت یا تحریر کے پہلے حوالے میں جلد کی 'ج' اور صفحہ کے 'ص' کا اندراج ضرور کیا جائے تاکہ کم سواد بھی اسے سمجھ لے۔

○

کتابیات

اردو املا، غلام رسول، ادارۂ ادبیات اردو، حیدر آباد، اول ۱۹۶۰ء
اردو املا، رشید حسن خاں، ترقی اردو بورڈ، دہلی، اول ۱۹۷۴ء
اردو املا اور اس کی اصلاح، ڈاکٹر ابو محمد سحر، مکتبۂ ادب، بھوپال، اول ۱۹۸۳ء
اردو املا اور رسم الخط، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، اول ۱۹۷۷ء
اردو رسم الخط، پروفیسر سید محمد سلیم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۱ء
ارمغان آزاد، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری، المخزن پرنٹرز، کراچی، ۱۹۹۰ء
اوقاف العبارت، محمد نظام الدین حسن نوتنوی، نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۰۴ء
املا نامہ، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی، ۱۹۷۴ء
املا نامہ، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی، ۱۹۹۰ء
املا و رموزِ اوقاف کے مسائل، اعجاز راہی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، اول ۱۹۸۵ء
انجمن اسلام کے سو سال، سید شہاب الدین دسنوی، انجمن اسلام بمبئی، اول ۱۹۸۶ء
بمبئی میں اردو، ڈاکٹر میمونہ دلوی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، بمبئی ۱۹۷۰ء
تحقیقی مباحث، رؤف پاریکھ، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۲۰۲۳ء
تحقیق کا فن، گیان چند، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ، ۱۹۹۰ء
تنقید قواعد اردو، مولوی محمد عبد الغنی، مطبع مفیدِ عام لکھنؤ، ۱۹۱۹ء
جامع القواعد، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، اول ۱۹۷۳ء

رسالہ قواعدِ صرف ونحوِ اردو، شیخ امام بخش صہبائی، منشی نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۸۸۰ء
رسالہ نجوم العلامات، منشی غلام محمد، مطبعِ ہری بالنگو، بمبئی، ۱۸۷۲ء
سفارشاتِ املا ورموزِ اوقاف، اعجاز راہی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء
عبارت کیسے لکھیں، رشید حسن خاں، مکتبہ پیامِ تعلیم، دہلی، ۲۰۰۶ء
علاماتِ قرأت، مشتاق حسین، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۳ء
قواعد اردو، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، طبع دوم ۱۹۲۶ء
قواعد اردو، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، سولھویں اشاعت، ۱۹۹۴ء
قواعد صرف ونحو زبان اردو، سر سید احمد خاں، مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری، الحزن پرنٹرس، کراچی ۱۹۹۰ء
کتابیات اردو املا اور دوسرے مسائل، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، اول ۱۹۸۶ء
کیفیہ، برج موہن دتاتریہ کیفی، مکتبہ معین الادب لاہور، ۱۹۵۰ء
مکاتیب غالب، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، رامپور، طبع ششم، ۱۹۴۹ء
معیار الاملا، منشی دیبی پرشاد سحر، مطبع نول کشور لکھنؤ، ۱۸۷۶ء
منتخب مقالات اردو املا ورموزِ اوقاف، مرتبہ: ڈاکٹر گوہر نوشاہی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، اول ۱۹۸۶ء
نقد واثر، ڈاکٹر شمس بدایونی، اصیلہ آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، ۲۰۰۴ء
اردو لغت تاریخی اصول پر (جلد ۱ تا ۲۲)، اردو لغت، کراچی ۱۹۷۷ء تا ۲۰۱۰ء
فرہنگ آصفیہ (جلد ۱ تا ۴)، سید احمد دہلوی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء
نور اللغات، (جلد ۱ تا ۴) مولوی نور الحسن نیر، قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی ۱۹۹۸ء
مستند پاپولر جدید اردو لغات، ناشر: اورینٹل بک سوسائٹی لاہور، نامِ مرتب وسنہ اشاعت ندارد

ooo

اشاریہ

یہ اشاریہ پیش گفتار، معروضات، کتاب میں شامل جملہ تحریریں اور حواشی پر مشتمل ہے۔ اسے اشخاص، کتب اور رسائل تک محدود رکھا گیا ہے۔

آدم: ۴۰

آزاد، ابوالکلام، مولانا: ۲۸، ۴۹، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۱۰۰، ۱۰۷، ۱۱۰، ۱۱۸

آزاد، محمد حسین: ۱۵۵

آصف الدولہ، نواب: ۳۹

ابن صفی: ۱۷۴

ابوسلمان شاہجہانپوری: ۵۹، ۸۶، ۱۰۲، ۱۰۵

ابومحمد سحر، ڈاکٹر: ۱۰۹

ابوہریرہؓ: ۳۱

اجمل اصلاحی، ڈاکٹر: ۱۱، ۲۹، ۴۲، ۴۵

احمد علی، سید: ۸۹

اختر اورینوی: ۱۹

اشرف علی تھانوی، مولانا: ۱۸۱

اشوک اعظم: ۱۸۱

اطہر مسعود خاں، ڈاکٹر: ۱۰۰، ۱۰۲

اعجاز راہی: ۹۵، ۱۱۴

افسوس، شیر علی، میر: دیکھیے شیر علی افسوس

اقبال سلمان، محمد: ۱۳۱، ۱۵۳

اقبال، محمد اقبال، علامہ: ۱۲۹، ۱۶۲

اکبر اعظم: ۴۱، ۱۸۱

اکبر علی تھانوی: ۱۸۱

التتمش، شمس الدین: ۱۸۱

امام حسینؑ: ۴۰

امتیاز علی خاں عرشی، دیکھیے: عرشی

امیر خسرو: ۱۷۸

انصار اللہ محمد، ڈاکٹر: ۲۶

انیس لکھنوی، مرزا: ۱۴۳، ۱۶۲

برج موہن دتاتریہ کیفی، پنڈت، دیکھیے: کیفی دہلوی

برہان الدین غریب، شیخ: ۴۹

بکرماجیت، راجہ: ۳۶

بیخود بدایونی: ۱۸۸

بیخود دہلوی: ۱۸۸

پرسی ڈبلیو لونگ: ۱۳۱

تنویر احمد علوی، ڈاکٹر: ۱۸۶، ۱۹۳

ٹی آر رینا، ڈاکٹر: ۵۲، ۱۰۰
جلال الدین سیوطی: ۳۳
جمشید احمد ندوی، پروفیسر: ۱۲
جوہر، مولانا محمد علی: ۱۴۲
جہانگیر: ۱۸۱
جی ایف آئی گراہم: ۱۸۲
حالی، الطاف حسین: ۷۹، ۸۰، ۸۵، ۱۰۷، ۱۳۹
حامد حسن قادری: ۱۴۴
حسرت موہانی: ۱۴۲
حسن عباس، سید، پروفیسر: ۴۵
حفیظ الدین: ۶۱
خلیق انجم، ڈاکٹر: ۲۰۴
خلیل الرحمٰن داؤدی: ۱۲۹، ۱۳۰
داغ دہلوی: ۱۸۸
دبیر، مرزا: ۴۶
درد، خواجہ میر: ۱۲۹
ڈنکن فاربس: ۶۳
رشید حسن خاں: ۲۳، ۳۲، ۴۲، ۵۲، ۶۱، ۸۳، ۹۰، ۹۱، ۹۳، ۹۶، ۹۸، ۱۰۰، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۳، ۱۲۲، ۱۴۷، ۱۵۲، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۷۳، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۲۰۲، ۲۰۶
رکن الدین، شیخ: ۴۹
رؤف پاریکھ، ڈاکٹر: ۵، ۱۱، ۱۶، ۹۴
زاغ بدایونی، محمد مبین نازش: ۵۰، ۵۱
سجاد مرزا، مولوی: ۸۹
سرسید احمد خاں: ۸، ۱۰، ۳۱، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۳، ۷۱، ۷۶، ۸۰، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۷، ۱۰۲، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۷، ۱۲۱، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۳۰، ۱۳۳، ۱۴۹، ۱۵۶، ۱۵۹، ۱۶۱، ۱۶۵، ۱۷۱، ۱۷۶، ۱۸۲، ۱۸۵، ۱۸۶
سنجے کمار، ڈاکٹر: ۱۲
سید سلیمان ندوی: ۱۳۰
سید محمد خاں: ۶۳
سید ہاشم فرید آبادی: ۸۹
ش. ضحیٰ: ۱۲۹
شافع قدوائی، پروفیسر: ۱۰۲
شبلی نعمانی، مولانا: ۸۰، ۸۴، ۸۵، ۹۵، ۱۵۲، ۱۵۵، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۹۳
شبیر احمد عثمانی، مولانا: ۴۰
شریف کنجاہی، پروفیسر: ۱۱۴
شمس الرحمٰن فاروقی: ۳۳، ۳۴، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۶

شمس بدایونی: ۱۲، ۱۵، ۳۳، ۳۷، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۹۱، ۲۰۳
شوق، سکھ دیال سنگھ: ۷۹
شیر علی افسوس، میر: ۶۱
شیو پرشاد، راجہ: ۷۶
صغیر افراہیم، پروفیسر: ۱۰۰
صہبائی، امام بخش، شیخ: ۱۱، ۳۱، ۶۳، ۶۵، ۸۳، ۸۴، ۹۳، ۹۵، ۹۷، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۶، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۴۹، ۱۵۶، ۱۶۴، ۱۶۷، ۱۷۱، ۱۷۶، ۱۸۲، ۱۸۵، ۱۹۰
ضیاء الدین احمد خاں، نواب: ۱۵۴
ظفر احمد صدیقی، پروفیسر: ۱۰۱، ۱۸۱
ظفر الرحمٰن دہلوی: ۴۰
ظفر، بہادر شاہ: ۲۹
ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر: ۱۸۱
عابد حسین، سید، ڈاکٹر: ۱۱۳
عارف نوشاہی، ڈاکٹر: ۱۱، ۴۲
عالم مختار حق، محمد: ۴۵
عائشہ صدیقہؓ: ۳۱
عبدالحق، مولوی: ۱۰، ۸۶، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۶، ۹۸، ۱۰۰، ۱۰۲، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۹، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۷، ۱۳۰، ۱۳۶، ۱۵۰، ۱۵۲، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۵۹، ۱۶۱، ۱۶۵، ۱۷۲، ۱۷۷، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۰۲
عبدالرشید، پروفیسر: ۱۱، ۳۶، ۱۰۱
عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر: ۶۲، ۸۹، ۹۰
عبدالستار دلوی، پروفیسر: ۱۲
عبدالقادر سروری: ۱۶۳
عبدالقوی، ڈاکٹر: ۱۲
عبداللہ، سید، ڈاکٹر: ۱۸۰
عبدالماجد دریابادی: ۹۹، ۱۰۶
عبدالودود، قاضی: ۱۸، ۱۹، ۲۰
عثمان علی خاں، میر: ۱۲۸
عرشی، امتیاز علی خاں: ۲۷، ۳۲، ۳۵، ۴۴، ۵۷، ۵۸، ۹۰، ۱۰۱، ۱۰۷، ۲۰۶، ۲۰۷
عطاء خورشید، ڈاکٹر: ۱۲، ۲۸، ۲۹
علاؤالدین اصولیؒ: ۱۸۱
علی کرم اللہ وجہہ: ۴۶
علی حسن خاں، سید: ۱۸۱
عمادالدین کاشانی: ۴۹
عنایت اللہ، مولوی: ۸۹، ۱۸۱
غالب، مرزا: ۴۳، ۴۴، ۵۰، ۵۳، ۶۶، ۱۰۱، ۱۲۹، ۱۴۶، ۱۶۲، ۱۶۸، ۱۷۳، ۱۷۹، ۱۸۶، ۱۹۲

غلام رسول: ۲۹، ۳۸، ۹۳، ۱۱۰، ۱۲۰، ۱۲۸،
۱۴۰، ۱۵۹، ۱۶۶، ۱۷۲، ۱۷۸، ۱۸۶
غلام رسول مہر، مولانا: ۴۵
غلام محمد، شیخ: ۱۰۱
غلام محمد، منشی: ۵۴، ۶۶، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۸۲،
۹۳، ۹۵، ۱۰۱، ۱۱۷، ۱۵۲
غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر: ۴۹، ۹۳،
۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۲۰، ۱۴۱، ۱۵۳، ۱۸۸،
۱۹۳، ۲۰۲
فارسٹ لنٹ، ڈاکٹر: ۱۳۱
فانی بدایونی: ۵۱
فرقان سنبھلی، ڈاکٹر: ۱۰۲
فرمان فتحپوری، ڈاکٹر: ۳۷، ۹۳، ۱۰۷، ۱۰۸،
۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۴، ۱۲۸، ۱۳۰، ۱۴۲، ۱۷۸، ۱۸۸،
۱۹۳
فیصل احمد بھٹکلی، مولانا: ۱۲
قلق میرٹھی، مولابخش: ۶۶
کالی داس گپتا رضا: ۲۰۶
کیفی، برج موہن دتاتریہ: ۳۷، ۴۸، ۱۰۹،
۱۸۸
گل کرسٹ، ڈاکٹر: ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۷۱، ۹۱،
۹۲، ۹۳، ۹۵، ۹۷، ۱۰۰، ۱۰۷، ۱۸۲
گوپی چند نارنگ: ۱۱۳
گوہر نوشاہی، ڈاکٹر: ۵۹
گیان چند، ڈاکٹر: ۴۲، ۹۰، ۹۱، ۹۳، ۹۶،
۹۸، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۹،
۱۳۰، ۱۴۶، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۹، ۱۶۱، ۱۶۷،
۱۷۴، ۱۷۹، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۹۶
مالک رام: ۳۸، ۴۱، ۴۶، ۹۰، ۱۵۴، ۱۶۲،
۱۸۱، ۱۸۶، ۱۸۸، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷
محمدؐ: ۳۲، ۳۹، ۴۵، ۴۶، ۱۸۵
محمد اسمٰعیل پانی پتی: ۵۹
محمد اقبال: دیکھیے اقبال
محمد اکرام، شیخ: ۲۰۴
محمد تقی خاں بہادر: ۱۸۰
محمد حسن خاں: ۱۲۴
محمد زکریا، خواجہ: ۱۱۴
محمد سلیم، سید، ڈاکٹر: ۱۱۲، ۱۸۳
محمد صدیق خاں، ڈاکٹر: ۱۱۴، ۱۲۴
محمد عارف، سید، پروفیسر: ۹۴
محمد علی، مرزا: ۴۴، ۶۵
محمد علی، مولانا: ۱۴۲
محمود الحسن، شیخ الہند، مولانا: ۴۰
محمود شیرانی، حافظ: ۱۹، ۲۰۵
محی الدین، محمد: ۷۷
مختار الدین احمد، پروفیسر: ۵۸

مسعود حسن، سید:۱۳
مشتاق حسین:۵۹، ۶۰، ۱۰۰
مظفر علی، سید:۱۱۴
معین الدین شاہجہاں پوری، سید:۸۷
معین الرحمٰن، سید، ڈاکٹر:۲۰۴
ممتاز علی، سید:۸۴، ۹۶، ۱۱۸
ممتاز منگلوری:۱۱۴، ۱۲۲
مولوی صاحب: دیکھیے عبدالحق
مومن دہلوی:۵۱، ۱۶۲، ۱۷۳
مہر، حاتم علی:۴۴
مہیش پرشاد، مولوی:۵۷، ۹۰
میراں یعقوب:۴۹
میر تقی میر:۴۱، ۱۱۵، ۱۶۲، ۱۶۸، ۱۸۵
میمونہ دلوی، ڈاکٹر:۷۰
ن م راشد:۱۳۹
نذیر احمد، ڈپٹی:۷۷، ۱۳۹، ۱۵۵
نذیر احمد، پروفیسر:۲۰۷
نظام الدین حسن، محمد، نوتنوی: ۴۷، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۹۰، ۹۳، ۹۵، ۹۸، ۹۹، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۶۳، ۱۸۵
نظامی بدایونی:۴۳، ۱۰۱
نظیر اکبر آبادی:۱۶۲
نعیم الرحمٰن محمد، الہ آبادی: ۸۷، ۸۸، ۹۳، ۹۸، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۹، ۱۶۱
نوتنوی، دیکھیے: نظام الدین حسن نوتنوی
وحید الدین سلیم:۸۹، ۱۸۱
وزیر الحسن عابدی:۲۰۴
ولی اللہ، محمد فرخ آبادی:۲۸
ہارون خاں شروانی، پروفیسر:۸۷
ہمایوں:۱۴۷
ہوروونز، جوزف:۱۸۲
ہیلو:۶۶
یوسف:۴۰

کتب ورسائل

آب حیات:۱۵۵
آثار الصنادید:۳۱
آکسفر ڈلغت:۱۳
آئینہ تاریخ نما:۷۶
آئینہ غالب:۵۷
ابن الوقت:۱۵۵
اتر پردیش کے لوک گیت:۱۶۱
ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ:۱۵۴، ۱۶۰، ۱۸۶
اردو ادب کی تحریکیں:۱۸۸
اردو املا (خان) :۲۳، ۳۲، ۸۳، ۹۰، ۹۱، ۱۱۱، ۱۵۴، ۱۶۰، ۱۶۶، ۱۷۳، ۱۸۹، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۲۰۲

اردو املا (غ): ۲۹، ۳۸، ۱۲۰، ۱۲۸، ۱۴۱،
۱۸۶،۱۷۸،۱۶۶،۱۵۹
اردو املا اور اس کی اصلاح: ۱۰۹
اردو املا اور رسم الخط: ۲۶، ۳۷، ۱۴۶، ۱۷۹،
۱۹۳
اردو املا اور رموزِ اوقاف: ۵۹
اردو انسائیکلوپیڈیا: ۱۹۵
اردو دائرہ معارف اسلامیہ: ۱۹۵
اردو رسم الخط: ۱۱۲
اردو لغت تاریخی اصول پر: ۱۸، ۲۵، ۲۶،
۱۹۶،۱۹۵،۱۸۲،۱۱۴،۹۹،۵۲،۳۳،۳۱
اردو لغت کا شرعی محاسبہ: ۲۰۵
اردوے معلیٰ: ۱۹
ارمغان آزاد: ۴۹، ۸۶، ۱۱۸
اساسِ عربی: ۸۸
اصولِ تحقیق و ترتیب متن: ۱۹۳
الرموز: ۸۲، ۸۴
الفاروق: ۱۵۲، ۱۵۵، ۱۹۳
املا نامہ (اول) ۵۴، ۱۱۳
املا نامہ (دوم) ۳۷، ۴۲، ۵۶
املا و رموز اوقاف کے مسائل: ۹۵، ۱۱۳،
۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵
امیر اللغات: ۴۱، ۴۶، ۷۸
انتخاب قصائد مرزا رفیع سودا: ۱۰۱
انسائیکلوپیڈیا برٹینکا: ۱۳
اوقات العبارت: ۴۷، ۸۲، ۹۰، ۹۶، ۹۹،
۱۰۶
ایامیٰ: ۱۵۲
باغ اردو: ۶۱
باغ و بہار: ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۱۰۰
باقیات شبلی: ۶۳، ۱۰۰
بچوں کا حساب: ۴۳
برہان قاطع: ۱۹
بغیۃ الوعاۃ: ۳۳
بمبئی میں اردو: ۷۱
بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا: ۱۹
پنج آہنگ: ۲۴، ۲۰۴
تحقیق کا فن: ۴۲، ۹۲، ۱۲۱، ۱۴۶، ۱۵۵،
۱۶۱، ۱۶۷، ۱۷۴، ۱۸۰، ۱۸۶، ۱۸۸
تذکرۂ ماہ و سال: ۱۶۲
تذکرۂ معاصرین: ۲۰۵، ۲۰۷
تفہیم غالب کے مدارج: ۲۰۳
تقسیم علم ادب: ۸۲
تلامذۂ غالب: ۳۲، ۳۸، ۴۶، ۲۰۵
تنقیدی افکار: ۳۴، ۲۰۱
توبۃ النصوح: ۷۷، ۱۵۲

جامع القواعد: ۱۲۰، ۱۴۲، ۱۵۳، ۱۸۸، ۱۹۳،
۲۰۲
جواہر منظوم: ٦٦
جہات سر سید: ۸
چند کنی پہیلیاں: ۸۸
حقائق و بصائر: ۲۴
حیات جاوید: ۱۵۲
خرد افروز: ٦١
خطوط شبلی بنام آزاد: ۸۵
خطوط شبلی بنام خواتین فیضی: ۱۸۳
خطوط غالب: ۵۷
خلافتِ موحدین: ۸۸
خمخانۂ جاوید: ۳۷، ۲۰۷
داستان تاریخ اردو: ۱۴۴
دستور الفصاحت: ۵۷
دیوان حافظ: ۲۰۷
دیوانِ درد: ۱۲۹
دیوانِ غالب: ۲۹، ۳۲، ۵۷، ۵۸، ۱۰۱،
۲۰٦
ذکرِ غالب: ۳۸، ۴٦
رسالہ صرف و نحوِ قواعدِ اردو: ۱۱، ۳۱، ٦۳، ٦۴،
۹۵، ۱۱٦، ۱۲٦، ۱۳۰، ۱۳۳، ۱۵٦، ۱٦۵، ۱۷۱
رسالۂ قواعد اردو (دہلی): ٦۳
رسالۂ قواعد اردو (لاہور): ۱۰۹
رسالۂ نجوم العلامات: ٦۷، ۷۱، ۷۲، ۹۵،
۱۱۷، ۱۵۲
رموزِ اوقاف (تحریر کا حسن): ۹۴
سفارشات اردو املا ۲۰۲۲ء: ۱۱۵
سفارشاتِ املا ورموزِ اوقاف: ۵۲، ۵۴،
۹۵، ۱۱۴
سیرۃ النبی: ۱۵۲
شبلی کی ادبی و فکری جہات: ۱۳۰
شعر شور انگیز: ۳۳، ۲۰۱
شعر العجم: ۳۷
شمائل الاتقیا: ۴۹
صحیفۂ تعین زمان: ۸۲
صحیفۂ حرمتِ ربو: ۸۲
عبارت کیسے لکھیں: ۱۱۱، ۱۴۸، ۱۵۵، ۱٦۲،
۱٦۵، ۱٦۷، ۱۷۳، ۱۸۷
علاماتِ قرأت: ۵۹، ٦۰، ٦۲، ۷۲، ۷۴،
۱۰۰، ۱۱۸، ۱۲۷، ۱۳٦، ۱۵۰، ۱۵۷، ۱۷۲،
۱۷۷، ۱۸۵
غالب شاعر امروز و فردا: ۱۴۴
غالب کچھ تحقیق کچھ تنقید: ۲۰۲
غالب کے خطوط: ۲۰۴
غبار خاطر: ۲۰۵

فرہنگ آصفیہ: ۳۳، ۴۴، ۱۸۲
فرہنگ اصطلاحات پیشہ وران: ۳۱، ۴۰
فسانۂ عجائب: ۱۶۱، ۱۸۳
فلسفہ اجتماع: ۹۹، ۱۰۶
قاطع برہان: ۱۹
قاطع برہان ورسائل متعلقہ: ۴۸، ۱۸۸، ۲۰۷
قاموس المشاہیر: ۲۰۷
قرآن کریم: ۱۴، ۲۵، ۲۶، ۲۸، ۴۰، ۴۵، ۵۰، ۶۶، ۱۰۶، ۱۸۷
قرآن مجید مترجم بہ زبان اردو: ۸۲، ۸۳، ۸۴
قواعد اردو: ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۱۰۶، ۱۱۰، ۱۱۹، ۱۲۸، ۱۳۹، ۱۵۲، ۱۵۹، ۱۶۱، ۱۶۵، ۱۷۲، ۱۷۸، ۱۸۶، ۱۹۷، ۲۰۲
قواعدِ زبان انگریزی: ۴۴، ۶۵
قواعد صرف ونحو زبان اردو: ۲۳، ۵۹، ۱۰۳
کتابیات اردو املا ودوسرے مسائل: ۱۰۵
کربل کتھا: ۱۴۶
کلیات نظم فارسیِ غالب: ۱۹
کیفیہ: ۱۰۹، ۱۸۸
گفتارِ غالب: ۱۵۴، ۱۸۶، ۱۸۸
گلدستۂ دانش: ۷۷
گلستانِ سعدی: ۶۱
گنجینۂ معنی کا طلسم: ۲۰۶
گنجینۂ مہر: ۴۵
لغات روزمرہ: ۳۴، ۲۰۱
مآثر غالب: ۱۹
محصنات: ۱۵۲
محمد شبلی نعمانی: ۱۸۲
مراۃ العروس: ۱۳۹
مزارِ غالب: ۱۳۱، ۲۰۳
مسالک النظر: ۸۸
مسدس حالی: ۱۳۹، ۱۵۲
معلم الحساب: ۴۳
معیار الاملا: ۲۳، ۲۵، ۲۶
مقالات حافظ محمود شیرانی: ۱۳۰
مقالاتِ سرسید: ۵۹
مقالات عبدالستار صدیقی: ۶۳
مکاتیب سرسید احمد خاں: ۱۰۰
مکاتیب غالب: ۲۷، ۳۵، ۴۴، ۵۷، ۱۰۱، ۱۰۷
منتخب مقالات اردو املا ورموز اوقات، دیکھیے: اردو املا ورموزِ اوقاف
موازنہ انیس ودبیر: ۱۵۲
مہار بھات مکمل: ۷۹

ناتن: ۸۸
نپولین اعظم: ۸۷
نسخہ حمیدیہ، دیکھیے: دیوان غالب
نسخہ گل رعنا: ۲۰۴
نظم الجواہر و تصد الفرائد: ۲۸
نقد و اثر: ۱۸، ۲۱
نقوش سلیمانی: ۱۳۰
یادگار غالب: ۷۹، ۸۰، ۱۰۷، ۱۵۲
یادگار نامہ قاضی عبدالودود: ۱۸

رسائل

اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ: ۵۹، ۷۲، ۷۴، ۱۰۲
اردو (اورنگ آباد، علی گڑھ، دہلی): ۸۷، ۸۸، ۸۹
اردو (کراچی): ۵۸، ۱۹۸
اردو انسٹرکٹر (بمبئی): ۷۰
اردو دنیا (دہلی): ۶۵
پرشین ٹیچر (بمبئی): ۷۰
تہذیب الاخلاق (علی گڑھ) ۸، ۵۸، ۵۹، ۷۲، ۷۴، ۷۵، ۹۴، ۱۰۲
خدنگ نظر (لکھنؤ): ۸۶، ۱۱۸
صحیفہ (لاہور): ۱۳۱، ۱۵۳
علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (علی گڑھ): ۵۸، ۵۹، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۱۰۱، ۱۰۲
فکر و تحقیق (دہلی) ۷، ۸
فکر و نظر (علی گڑھ): ۵۸، ۵۹، ۶۰
کہکشاں (لاہور): ۸۴، ۸۵، ۱۱۹
لسان الصدق (کلکتہ): ۸۵، ۸۷، ۱۸۲
معارف (اعظم گڑھ): ۵۰، ۹۳
نوائے ادب (بمبئی): ۱۹، ۵۸
وکیل (امرتسر): ۱۰۱
ہندوستانی (الہ آباد): ۸۸، ۱۲۰

OOO

ہزاروں ہزار شکر ہے اُس خالقِ لوح و قلم کا، جس کے دو حرف 'کاف' اور 'نون' سے تخلیق کا سوتا پھوٹ پڑا اور یہی سمندر بن کر کشتیِ سخن کو آج تک رفتار دیے ہوئے ہے۔ اسی کا ایک مظہر ہے یہ کتاب ''رموزِ او قاف: کب، کہاں اور کیوں؟'' مؤلفہ شمس بدایونی۔
خاکسار ممنون ہے ڈاکٹر اطہر فاروقی کا، جن کے زیرِ اہتمام انجمن ترقیِ اردو (ہند) دہلی نے ۱۴۴۵ ہجری مطابق ۲۰۲۴ عیسوی میں اسے اشاعت سے ہم کنار کیا۔

RUMOOZ-E AUQAAF
Kab, Kahan aur Kyon?
by Dr. Shams Budauni

''......رموزِ اوقاف (punctuation marks) وہ نشانات و علائم و رموز و مخففات ہیں جن کی مدد سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ کسی متن کو کیسے پڑھنا ہے۔ ان علامات ونشانات کی عدم موجودگی میں متن کا مفہوم تبدیل ہونے کا بھی خطرہ رہتا ہے جس کی طرف ڈاکٹر شمس بدایونی صاحب نے اس کتاب میں اشارہ بھی کیا ہے۔

......اردو والے اس طرح کی ''خرافات'' سے بے نیاز ہیں، الا ماشاء اللہ۔ حالانکہ قرآن شریف کی قرأت میں علامات بہت اہم ہیں اور ان کو ملحوظ نہ رکھنے سے بعض صورتوں میں نہ صرف عربی عبارات بلکہ اردو میں بھی مفہوم تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس ساری تقریرِ غیر دل پذیر کا منشا و مقصد صرف یہ یاد دلانا ہے کہ اردو میں رموزِ اوقاف کا استعمال بہت بعد میں شروع ہوا اور ہماری ان سے بے نیازی کا اب بھی وہی عالم ہے حالانکہ تحقیق کے جدید طریق کار (methodology) میں علائم و رموز کی بہت اہمیت ہے اور حواشی اور کتابیات میں بھی ان کے استعمال پر بہت زور دیا جاتا ہے، حتیٰ کہ کاما اور سیمی کالن اور کالن کے استعمال میں بھی فرق و تمیز کی تاکید کی جاتی ہے۔ شمس بدایونی صاحب نے ان پر خوب روشنی ڈالی ہے، ان کی تاریخ بھی منضبط انداز میں بیان کی ہے اور اردو میں ان کے استعمال اور اصولی مباحث پر بھی خاصی تحقیق کے بعد اہم نتائج اخذ کیے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ محض لکیر کے فقیر یا ناقل یا مرتب نہیں ہیں بلکہ انھوں نے اکثر مقامات پر رائج خیالات یا ماضی کے محققین سے اختلاف کیا ہے اور اپنی رائے قائم کی ہے۔ بعض رموز اس کتاب میں ایسے ہیں کہ کہیں اور ان کا ذکر شاید ہی ملے۔

ڈاکٹر صاحب کی محنت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اول تو اس موضوع پر بہت کم اردو میں لکھا گیا ہے اور جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اسے ڈاکٹر صاحب نے کمال اختصار سے سمیٹ لیا ہے اور...... یہ اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا کام ہے جس میں رموزِ اوقاف کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

ISBN: 978-81-970897-6-3
ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
Urdu Ghar : 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
Phone : 0091-11-23237722, Website : www.atuh.org
Cover design by Muhammad Sajid